ساغر نظامی کی نایاب نظم

ماضی

تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر فاروق بخشی

ساغر نظامی کی نایاب نظم

تجزیاتی مطالعہ

کتاب کا نام :- ساغر نظامی کی نایاب نظم - 'ماضی'

مرتب :- ڈاکٹر فاروق بخشی، صدر، پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو،
گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی آف کوٹہ، راجستھان

گرافکس :- ہند گرافکس، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی - ۲۵

تزئین کار :- رزینہ بخشی

قیمت :- 150 روپے

سن اشاعت :- فروری ۲۰۰۷ء

ISBN No. 81-89461-76-6

ملنے کے پتے

ڈاکٹر فاروق بخشی، KR64 سول لائنز، کوٹہ، راجستھان

کتابی دنیا 1955 گلی نواب مرزا، اپوزیٹ انگلو عربک اسکول،
محلہ قبرستان، ترکمان گیٹ، دہلی ۔ 6

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی - 110002

انتساب

اپنے بابا

شاعر ہندوستان

انیسؔ العصر

حضرت مہدی نظمیؔ

کے

نام

فہرست

پیش لفظ

اردو کی طویل نظم نگاری کی تاریخ میں ساغر نظامی کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو غزل کے حوالے سے خدائے سخن میر تقی میرؔ کا ہے۔ مگر یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ ہمارے یہاں ساغرؔ کی طویل نظموں کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ مشعلِ آزادی اور نہرو نامہ ساغرؔ کی وہ طویل نظمیں ہیں جو اپنے رنگ و آہنگ اور رزمیاتی شان کی بدولت اردو ادب کی تاریخ میں انفرادیت کی حامل ہیں۔

میں نے جب ساغرؔ نظامی پر اپنا تحقیقی کام شروع کیا تو ساغرؔ صاحب نے مجھے اپنی ایک طویل غیر مطبوعہ نظم ''ماضی'' بھی مطالعے کے لیے عنایت فرمائی تھی۔ پورے صفحے کے سائز پر یہ نظم کل 57 صفحات پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس نظم کا تذکرہ بھی کیا تھا اور اس کا تجزیہ بھی۔ تحقیقی مقالے کو میرٹھ یونی ورسٹی کے سپرد کرکے اور ڈگری کے حصول کے بعد میں دوسرے کاموں میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا۔ فسادات کے دوران غازی آباد کا گھر جلا تو میں نے اپنے عزیزوں کی جانوں کے ساتھ ساتھ اپنے بہت سے ادبی سرمائے کے تلف ہو جانے پر اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا۔ پچھلی تعطیلات میں میرٹھ جانا ہوا تو صفائی کے دوران برادر عزیز ڈاکٹر جلال انجم کو چچا جان محترم حکیم سید فیضی ظہیری صاحب کی کتابوں میں ساغرؔ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ''ماضی'' کا نسخہ مل گیا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ قبلہ و کعبہ پروفیسر قمر رئیس صاحب کو نظم کا مسودہ دکھایا تو انہوں نے نہ صرف میری پیٹھ تھپتھپائی بلکہ مجھے ذہنی طور پر اس کی اشاعت کے لئے بھی آمادہ

کرلیا۔ اس نظم کی اشاعت یوں بھی ناگزیر ہوگئی کہ یہ سال ساغر نظامی کی صد سالہ تقریبات کا سال ہے۔

ساغر نظامی جنہوں نے تا عمر ملک کی تحریک آزادی کو اپنی جوشیلی نظموں سے گرمائے رکھا تھا وہ آج کے دور سیاست کی نذر ہوگئے۔ لہٰذا یہ نظم اس آزادی کے نغمہ خواں ساغر نظامی کو خراج عقیدت ہے، جن کی ساری عمر آزادی، سوشلزم اور قومی یکجہتی کے نغمے تخلیق کرتے گزری۔

میں اس کاوش کو اپنے محسن و مربی اردو کے مشہور شاعر حضرت مہدی نظمی کو معنون کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، جن کے کارناموں کی پذیرائی اردو والوں پر ایک قرض کی طرح واجب ہے۔ میں شکر گزار ہوں برادرِ عزیز ڈاکٹر جلال انجم کا جن کی مخلص دوستی میرے لئے زندگی کا ایک نہایت ہی حسین تحفہ ہے۔

فروری ۲۰۰۷ء

(ڈاکٹر) فاروق بخشی

صدر

پوسٹ گریجویٹ، شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج، کوٹہ یونیورسٹی آف کوٹہ

راجستھان

ساغر نظامی

سوانحی حالات

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیاں انسان اور انسانی زندگی کی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہمیت و انفرادیت کی حامل ہیں۔ اقوام عالم کی زندگی میں تغیر و تبدل کی رفتار شاید ہی کبھی اتنی تیز رہی ہو۔ زندگی کا کوئی میدان ہو سب میں انقلاب کچھ اس تیزی اور زور شور سے آیا کہ دنیا کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ سیاسی میدان میں ایک ہندوستان ہی نہیں ایشیا کے تمام غلام ممالک اپنے گلے سے غلامی کا طوق اتارنے کی جدّ و جہد میں مصروف تھے اور اس صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے ان میں سے بیشتر قوموں نے آزادی حاصل بھی کر لی تھی۔ سائنسی ترقی بھی اس صدی میں حیرت انگیز طور پر ہوئی اور جس آدم خاکی سے ابھی تک انجم سہمے ہوئے تھے اس نے ان سیاروں پر اپنے قدموں کے نقوش ثبت کر دیے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس صدی کے ابتدائی سال بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، احسان دانشؔ، حفیظؔ جالندھری اور ساغرؔ نظامی جیسے ممتاز شعراء نے اپنی شناخت قائم کی پیدا ہوئے۔

ولادت

ساغؔر نظامی کا اصلی نام صمد یار خاں تھا۔ وہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو محلّہ بالائے قلعہ علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ساغر نظامی کی تاریخ ولادت ان کی حیات میں اُن کے کوائف کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکی تھی اور خود اپنے تحریر کردہ حالات (Bio-Data) میں بھی انہوں نے اپنی جائے ولادت اس طرح تحریر کی ہے :

''۲۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء محلّہ بالائے قلعہ علی گڈھ'' [۱]

اس لئے اس سلسلہ میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ مالک رام نے ان کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش سے متعلق ذرا واضح انداز میں لکھا ہے :

''وہ اپنے مکان محلہ بالائے قلعہ علیگڈھ میں جمعرات ۲۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء فجر سے قبل تقریباً چار بجے پیدا ہوئے۔'' [۲]

خاندانی پس منظر

ساغؔر نظامی اپنے خاندانی حالات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے جد امجد کا نام ''نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر (ہریانہ) شہید جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تھا'' [۱] اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں بھی انھوں نے نواب جھجر کو اپنا پردادا بتایا

---

[۱] ساغر نظامی کے تحریر کردہ حالات سے جو انھوں نے خود مرتب کئے تھے۔
[۲] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۷۳، مرتبہ ضامن علی خاں، ساغر نظامی میموریل اکاڈمی

تھا۔ ساغر نظامی کا یہ انٹرویو جسے ڈاکٹر خلیق انجم نے لیا تھا اور وہ ۲۳/ دسمبر ۱۹۸۲ء کو دہلی سے نشر ہوا تھا لیکن ساغر نظامی کی اس تحریر کی صداقت میں شبہ ہوتا ہے۔ تاریخ جھجر کے مولف منشی ابوالاعجاز غلام نبی میرٹھی جو ریاست کے قدیم ملازم اور اس عہد کے بیشتر واقعات کے عینی گواہ ہیں لکھتے ہیں :

"نواب عبدالرحمٰن خاں کی چودہ بیویاں تھیں جن میں سے صرف تین نواب کی منکوحہ بیویاں تھیں اور بقیہ سب کنیزیں اور حرمین تھیں۔ نواب عبدالرحمان خاں کو انگریزوں نے بجرم بغاوت و بدخواہی ۲۴/ دسمبر ۱۸۵۷ء کو دو گھڑی دن رہے کوتوالی شہر میں پھانسی پر لٹکا دیا۔ نواب عبدالرحمان خاں کی جملہ بیویوں اور کنیزوں سے اولاد میں چار بیٹے سرفراز علی خاں، نور علی خاں، عشرت علی خاں، خلیل الرحمان خاں اور آٹھ بیٹیاں تھیں۔" [۲]

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نواب عبدالرحمان خاں کے کسی بیٹے کا نام محمد یار خاں نہیں تھا۔ جبکہ ساغر نظامی کے دادا کا نام محمد یار خاں تھا۔ ایک جگہ انھوں نے اپنے پردادا کا نام سردار شہ باز خاں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سردار شہ باز خاں نواب جھجر کی فوج کے سپہ سالار تھے اور غدر میں انھیں نواب کے ساتھ پھانسی دی گئی۔" [۳]

تاریخ جھجر میں کہیں کسی شہباز خاں کا تذکرہ نہیں ملتا، چنانچہ اس سلسلہ میں مالک رام صاحب فرماتے ہیں :

۱۔ ساغر نظامی کے تحریر کردہ حالات سے

۲۔ تاریخ جھجر، بحوالہ مالک رام مشمولہ ساغر نظامی: فن اور شخصیت، صفحہ ۳۷

۳۔ تذکرہ بہارستان، صفحہ ۷۰، مشمولہ ساغر نظامی: فن اور شخصیت، صفحہ ۳۷

"سردار شہ باز خاں بھی نہ نواب عبدالرحمٰن خاں کے بیٹے تھے نہ جھجر کی فوج کے سپہ سالار نہ اس نام کے کسی شخص کو نواب موصوف کے ساتھ پھانسی دیگئی ریاست کی فوج کی کمان جرنل عبدالصمد خاں کے ہاتھ میں تھی نواب کی پہلی بیوی کافیہ بیگم المُقلّب بہ نور محل انھیں کی بیٹی تھیں بعد کو اختلاف پیدا ہو گئے اور نواب عبدالرحمٰن خاں نے ان کو الگ کر دیا اور ان کا عہدہ بھی انھیں کے ساتھ تخفیف میں آ گیا۔" [1]

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں نہ تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہ باز خاں جھجر کی فوج کے سپہ سالار تھے اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجر سے ساغر نظامی کا کوئی نسبی تعلق تھا۔ لیکن پھر ایسی کیا وجہ تھی کہ ساغر نظامی نے اپنی ذات کو نوابی خاندان سے منسوب کیا؟ اس کی تہہ میں کہیں کوئی ایسا احساس کمتری تو نہیں تھا جو انھیں یہ سب کہنے اور کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ یہ بات بڑی غور طلب ہے کیونکہ ساغر نظامی کے دو اہم معاصرین اور ان کے قریبی دوست مجازؔ اور جوشؔ ملیح آبادی ایسے ہی اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ساغرؔ نظامی نے اپنی حیثیت بڑھانے کے لئے یہ شجرہ تراشا۔ بہر کیف ساغرؔ نظامی جس مزاج اور ذہن و دل کے انسان تھے اس سے اندازہ نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے کوائف پر پردہ کیوں ڈالے رکھا؟ اپنے دوست ضیاء الاسلام کو ایک مکتوب مورخہ ۱۴؍ ستمبر ۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں :

"میری سمجھ میں ان کی اور مجاز کی تنقیح مطلق نہیں آئی۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں۔ رسالہ نکالوں تو اس کو فروخت نہ کروں، کتاب چھاپوں تو اس کو بیچوں نہیں؟ کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟"

"مجاز صاحب کو معلوم نہیں کہ میں نے ان کی طرح باپ پر سولہ سال کی عمر سے تکیہ نہیں کیا۔ جس وقت بچے اسکول میں پڑھا کرتے ہیں اس وقت سے میری

---

[1] ساغر نظامی : شخصیت اور فن، صفحہ ۴۷

> عملی زندگی شروع ہوئی ہے۔ میں نے توریث کے پوتڑے نہیں سمیٹے۔ میں خود اپنا خالق اور کارساز ہوں۔ جوش صاحب کو زعم ہے کہ وہ ایک نواب کے پوتے ہیں، مجھے فخر ہے کہ کسی نواب کا پوتا نہیں ہوں۔ میں ایک سپاہی کا بیٹا ہوں اور سپاہی کی جرأت میرے لئے زندگی کے مقابلہ کے لئے موجود ہے۔" [1]

ساغر نظامی کا یہ خط ذرا طویل ہوگیا ہے لیکن یہاں اس بات کی اہمیت یہ ہے کہ ساغر نظامی نے کبھی اپنے آپ پر اس لئے فخر نہیں کیا کہ ان کا نسبی تعلق کسی نواب سے ہے، بلکہ وہ اس بات کو اچھا سمجھتے تھے کہ انسان زندگی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مسائل خود حل کرے۔ وراثت پر بے جا فخر انسان کو کاہل، کام چور اور نکما بنا دیتا ہے۔ مجاز کی شراب خوری اور ان کی بدمستی اور مدہوشی کی حالت میں ان کی ناگہانی موت اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ لیکن ساغر نظامی کو اپنے جوہرِ ذاتی کی قدر و قیمت کا احساس تھا اور وہ ہر قیمت پر اس کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بہرحال اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ساغر نظامی نجیب الطرفین افغان تھے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق ساغر نظامی کا شجرۂ نسب کچھ اس طرح تیار ہوتا ہے:

---
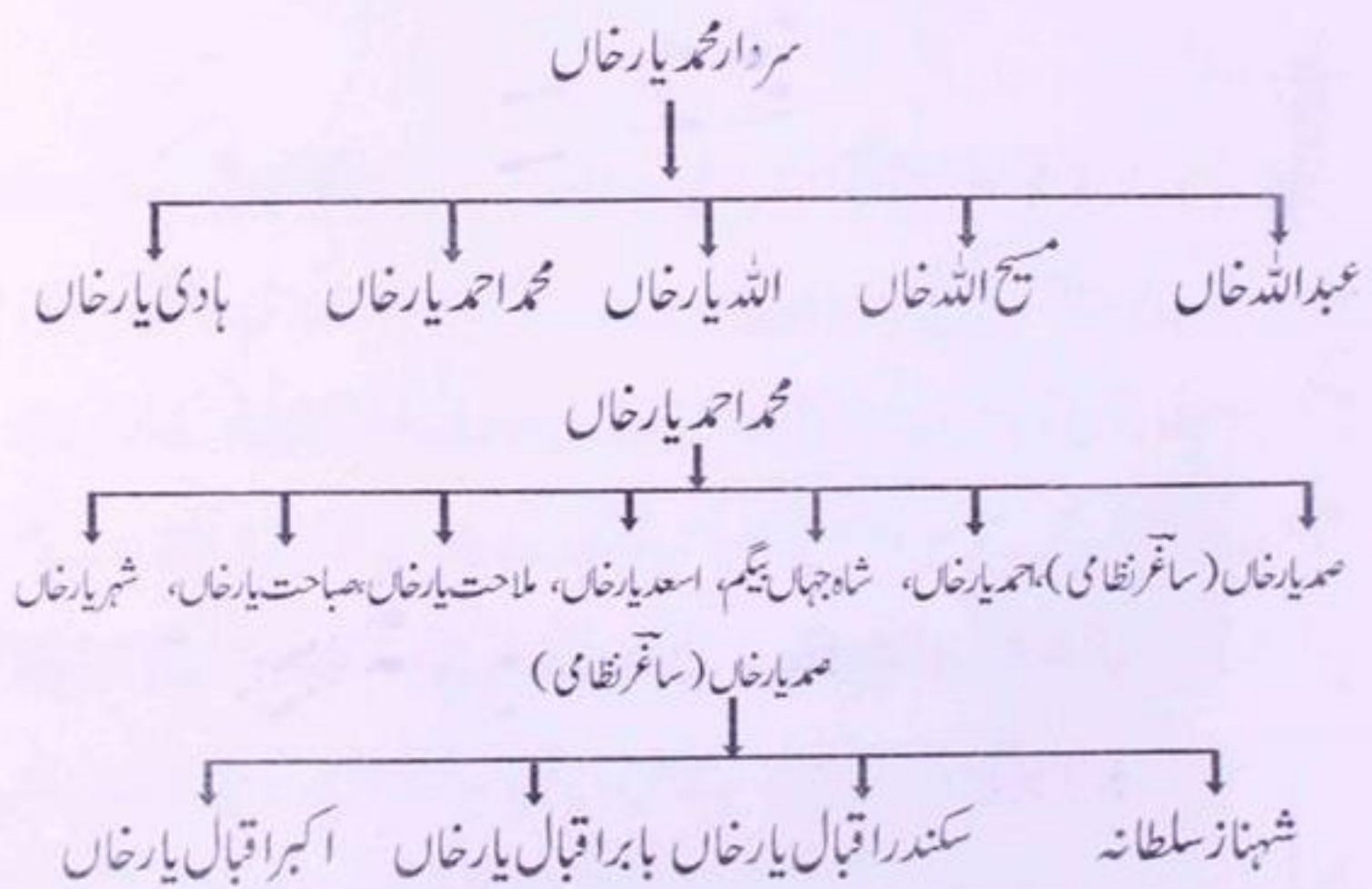
[1] ہم عصر شعراء کے خطوط، صفحہ ۱۲۹، مرتب ضیاء الاسلام

ددھیائی کے علاوہ ننہال کی طرف سے بھی ساغر نظامی افغان النسل ہیں۔ ان کے ماموں زاد بھائی احسن رضا خاں نے جو علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں، ایک انٹرویو میں بتایا :

''ہم لوگ ۱۸۶۲ء سے علی گڑھ میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے پردادا افضل خاں افغانستان سے ہجرت کر کے علی گڑھ میں آکر آباد ہو گئے تھے اور یہیں جج کے کورٹ میں منصرم ہو گئے۔ ہمارا تعلق یوسف زئی قبیلے سے ہے۔'' [1]

احسن رضا خاں صاحب نے یہ بھی بتایا کہ افضل خاں صاحب کے ایک صاحبزادے علی رضا خاں راجا مرسانا کے یہاں داروغۂ شکار مقرر ہوئے تھے۔ احسن رضا خاں صاحب کے بیان کی روشنی میں ساغر نظامی کا ننہالی سلسلہ اور شجرۂ نسب کچھ اس طرح تیار ہوتا ہے :

افضل خاں

علی رضا خاں　　　　حسن رضا خاں

کوئی اولاد نہیں تھی

محسن رضا خاں　　عابد رضا خاں جمال صابری　　حامد رضا خاں تبسم نظامی

زاہد علی خاں

---

[1] احسن رضا خاں سے تحریری انٹرویو

اس کے علاوہ ساغر نظامی کی والدہ دو بہنیں تھیں زہرہ اور صغریٰ۔ صغریٰ ساغر نظامی کی والدہ کا نام تھا اور گھر میں سب لوگ انہیں پیار سے سوکھی کہتے تھے کیونکہ وہ بہت دبلی پتلی تھیں۔ ساغر نظامی کے والد محمد احمد یار خاں سے ان کی شادی ہوئی تھی جن کے بطن سے صمد یار خاں پیدا ہوئے جو بعد میں ساغر نظامی کے نام سے ہندوستانگیر شہرت کے مالک ہوئے۔ مندرجہ بالا تحقیق ساغر نظامی کو ایک اعلیٰ نسب کا شخص ثابت کرنے کے لئے کافی ہے لیکن راقم الحروف کی رائے میں اگر فن کار کا حسب نسب بہت زیادہ اعلیٰ ارفع نہ بھی ہو تب بھی اس کے مرتبہ پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ فن کار کے مرتبہ کا تعین اس کی تخلیقات کے وسیلے سے کیا جانا چاہئے۔ فن کار کا تخلیقی ذہن جو کچھ اس کائنات اور کائنات میں رہنے والے انسانوں کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے اور اس غور و فکر کے نتیجہ میں حیات انسانی کو بہتر اور باوقار بنانے میں جو مدد ملتی ہے دراصل وہی فن کار یا تخلیق کار کے مرتبہ کا تعین کرنے کے لئے کافی ہے۔

ساغر نظامی نے اپنی تمام عمر ادبی جدوجہد میں گزاری۔ انھوں نے اس وقت زبان و ادب کو اپنا کل وقتی کام بنایا جب اُردو سے دو وقت کی روٹی روزی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ آج تو ہر طرف سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اردو اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی مدد کے لئے موجود ہیں لیکن اس وقت کے حالات کا اندازہ کیجئے جب وطن پرستی اور آزادی کی بات کرنے کا مطلب اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کی زندگیوں کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ لیکن اس اندھیری رات کے سفر میں بھی ساغر نظامی کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی اور وہ مردانہ وار جنگ آزادی کے نقیب اور نغمہ خواں بنے رہے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں اپنے دوست ضیاء الاسلام سے اس طرح مخاطب ہیں :

''تم جانتے ہو میں نے محنت سے کبھی گریز نہیں کی۔ میری زندگی حالات کی بنیاد پر ایک مجاہدہ رہی اور اب بھی ہے مگر شاعرانہ زندگی کی یہ کشمکش ؎

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے

لیکن ہمیں کیا حق ہے جب ہم چیختے ہوئے زمانہ میں انقلابی خیالات کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں واقعی انقلاب کی نمائندگی اور ارتقاء کی ترجمانی کرنی ہے تو سب کچھ ٹھنڈے دل سے برداشت کرنا ہوگا۔'' [1]

مندرجہ بالا خط ساغر نظامی کے ذہنی رویہ کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے واقعی توریث کے پوتڑوں کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ وطن کی آزادی اور انسان دوستی کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ ایک اور مکتوب میں ضیاء الاسلام کو اطلاع دیتے ہیں کہ وہ طباعت کے لئے ایک پریس لگا رہے ہیں۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی اطلاع ہے لیکن خط کی دوسری باتوں سے ساغر نظامی کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

''ساغر برقی پریس کی اسکیم کی شاعرانہ تشریح یہ ہے کہ موجودہ زمانہ شعر وادب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور خود ہم لوگ وہ دل و دماغ نہیں رکھتے جو امراء اور والیان ریاست کی درباداری کر سکیں۔ اس لئے قدرتی طور پر میں زندگی کا پس منظر محنت کو پسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دوسروں کی طرح شاعری بھی کامل خودمختاریت اپنی زندگی میں قائم کرے۔'' [2]

ساغر نظامی کو اپنے وطن، اپنی تہذیب اور زبان سے کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل خط سے ہو سکتا ہے :

---

[1] ہم عصر شعراء کے خطوط، صفحہ ۸۹

[2] ہم عصر شعراء کے خطوط، صفحہ ۸۷

ساغر نظامی کی نایاب نظم 'ماضی'- تجزیاتی مطالعہ

''آج اردو کی حیات کا سوال ہے۔ ہم لوگ اپنی شکم پوری کے سلسلہ میں
ان اشغال میں اپنی عمر عزیز تباہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہمیں جنون ہے محبت ہے اور
ایک چٹک ہے جو اردو کے لئے کام کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔'' [1]

خطوط کا یہ سلسلہ طویل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ساغر نظامی کی تصنیفات میں ایسی ہزاروں تحریریں مل جاتی ہیں جن سے ان کی ادبی جدو جہد اور شاعرانہ پس منظر کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، لیکن تلاش بسیار کے باوجود مجھے کوئی ایسی تحریر نہ مل سکی جس سے یہ گمان ہوتا کہ ساغر نظامی اپنے حسب نسب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ایک حساس شاعر اور مجاہد انسان تھے جن کی زندگی کا مقصد اعلیٰ تھا۔ جوش کی طرح ان کی پٹھانیت قدم قدم پر شمشیر برہنہ بن کر سامنے نہیں آتی بلکہ ان کی کھردری پٹھانیت پر ہندوستانی تہذیب وتمدن کے گہرے نقوش قائم ہو چکے تھے۔ لہٰذا تہذیب کا وہ عمل جو انسانی شخصیت کو نکھار کر قابل تقلید اور قابل رشک بنا دیتا ہے اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ ایسے میں محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ والی جھجر نواب عبدالرحمٰن خاں کے پر پوتے تھے یا نہیں تخلیق کار کے منصب کو گرانا ہے۔

لہٰذا میرے نزدیک اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ساغر نظامی کے جد امجد نواب جھجر کے جانشین تھے یا ان کے اعلیٰ عہدہ دار۔ دیکھنا دراصل یہ ہے کہ ساغر نظامی کی شخصیت کی تعمیر میں کن عناصر کی کار فرمائی رہی؟ جنھوں نے ساغر نظامی کو ایک خوش کلام شاعر دل سے رومانی اور دماغ سے انقلابی خیالات کی حامل شخصیت بنایا۔ یہ گفتگو خاصی طویل ہوگئی ہے مگر اس بات کی وضاحت یہاں بہت ضروری تھی۔ یہاں ساغر نظامی کا ایک

---

[1] ہم عصر شعراء کے خطوط، صفحہ ۶۴

خط پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا جس سے ساغر نظامی کے مزاج اور ان کے ذہنی رویوں پر مزید روشنی پڑتی ہے :

''میں نے عین اس وقت جب ہر مسلمان کام کرنے والے کو مسلم لیگی ہونا سوشل جبر ہو گیا تھا ہندوستان سے وفاداری کا ثبوت دیا۔ میری زندگی کو کوئی شخص دو رخی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی نہیں میں نے کبھی نیشنلزم کو بھی ذریعہ تجارت نہیں بنایا مگر دوسروں نے بنایا۔ میں، مسز نائیڈو اور آنند نراین مُلّا اس کے گواہ ہیں۔ میں نے وطن سے کبھی غداری نہیں کی۔ میں کسی امیر کا مصاحب نہیں۔ کوئی شخص یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں بسلسلۂ امداد جنگ ہونے والے مشاعروں میں بھی شریک ہوا۔ میرا جو کیرکٹر ہے اس کو بہر حال میں نے باقی رکھا اور محنت کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرا اور نہ کبھی دیسی ریاستوں کے وظائف پر زندگی بسر کی۔ میں جس طرح زندگی بسر کرتا ہوں اس کے لئے ایوب کا صبر اور لوہے کی ہڈیاں درکار ہیں۔'' [1]

مندرجہ بالا خط کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ساغر نظامی نے اپنے ہم عصروں کی طرح دیسی ریاستوں سے وظائف اور امداد وصول نہیں کی بلکہ اس عہد میں برٹش حکومت شاعروں اور ادیبوں کو جو خیرات دیا کرتی تھی ساغر نظامی نے اسے ہمیشہ اپنے مزاج کے خلاف پایا، حالانکہ ان کے کئی مشہور و معروف معاصرین اس کام میں بھی لگے ہوئے تھے۔ ساغر نظامی نے اپنی زندگی کا مقصد ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر بنایا جہاں انسانوں کی تقدیر محض چند لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو

---

[1] ہم عصر شعراء کے خطوط، صفحہ ۱۲۹

بلکہ ملک کا نظام عام آدمی کے ہاتھوں میں ہوتا کہ اس کے ذریعہ ملک کے سب نمائندے اس کے دکھ درد کا خیال رکھ سکیں۔

تعلیم و تربیت

ساغر نظامی کی باقاعدہ تعلیم کہاں تک ہوئی اس سلسلہ میں کافی اختلافات ہیں۔ ساغر نظامی نے اپنے تحریر کردہ حالات میں اپنے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر رسمی تعلیم کے خانہ کو خالی چھوڑ دیا ہے۔ ان کی تعلیم کے بارے میں ضامن علی خاں لکھتے ہیں :

''ساغر نظامی نے باقاعدہ تعلیم کہاں پائی اس کا فیصلہ محققین اور ناقدین ہی کر پائیں گے۔ عربی فارسی اور اُردو پر انھیں عبور حاصل تھا، انگریزی بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیتے تھے، ہندی سے بھی اچھی طرح واقف تھے، مطالعہ بہت وسیع تھا اور مشاہدہ اس سے بھی زیادہ۔'' [1]

ماہ نامہ 'بیسویں صدی' اپریل ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ساغر نظامی کے جو حالاتِ زندگی شائع ہوئے ہیں وہاں بھی تعلیم کے عنوان کے نیچے :

''عربی فارسی اردو اور انگلش پر ملکہ حاصل تھا۔'' لکھا ہے۔

ظ۔ انصاری اپنے ایک مضمون ''ساغر نظامی جو اپنا کام کر گئے'' میں ساغر نظامی کی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں :

''ساغر اپنے گاؤں سے نکلے، چار قدم پر علیگڈھ کا ایم۔ اے۔ او کالج ابھی یونیورسٹی بنا تھا۔ اس کا ہائی اسکول تھا مگر وہ ادھر نہیں گئے بلکہ آس پاس کے

---

[1] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۱۰

مشاعروں میں جانے لگے۔" [1]

ظ۔ انصاری کے بیان سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ ساغر نے تعلیم کے مقابلہ میں آس پاس کے مشاعروں کو زیادہ اہمیت دی جبکہ ایسا نہیں تھا، کیونکہ یہ زمانہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا سنہرا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر انگریزی آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ خلافت تحریک کے ساتھ گاندھی جی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک نے برٹش حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں :

"ہر طرف جوش اور قربانی کا ماحول نظر آتا تھا۔ موتی لال، چترنجن داس، راجندر پرشاد اور چکرورتی راجگوپال آچاریہ جیسے بڑے وکیلوں نے اپنی بے انتہا منافع بخش وکالت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ہزاروں طالب علم اسکول و کالجوں سے باہر نکل آئے۔" [2]

ساغر نظامی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے خوددار ذہن نے انگریزی سرکار کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنا اپنی ہندوستانیت کی توہین سمجھا۔ اس سلسلہ میں مالک رام لکھتے ہیں :

"ساغر کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ نجی تعلیم کے بعد انہیں گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڈھ بھیج دیا گیا اور پھر چندے مسلم یونیورسٹی اسکول میں بھی پڑھتے رہے لیکن یہ زمانہ سیاسی افراتفری کا تھا اور کانگریس نے عدم تعاون کی تحریک میں ایک شق سرکاری اسکولوں کے بائیکاٹ کی بھی رکھی تھی۔ ساغر نے کانگریس کی اس دعوت پر لبیک کہا اور اسکول سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ اس وقت غالباً نویں درجہ کے طالب

---

[1] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۱۲۴

[2] ہندوستانی تحریک اور اس کی تاریخ، از ڈاکٹر تاراچند، صفحہ ۵۲۰

علم تھے۔ اس کے بعد عمر بھر کسی اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔'' [1]

بیگم ذکیہ ساغر کے بیان سے بھی مالک رام صاحب کے خیالات کی تائید ہوتی ہے :

''ساغر نے ایم۔ اے۔ او کالج کے ہائی اسکول میں نویں تک پڑھا اور گاندھی جی کی نون کاپریشن تحریک میں شریک ہو کر پڑھائی چھوڑ دی اور پھر جب ہوش آیا وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔'' [2]

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ساغر کی باقاعدہ تعلیم نویں درجہ تک ہوئی تھی لیکن یہ بات بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں کی ہے۔ جن لوگوں کو اس عہد کے تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت میسر رہی ہے بخوبی جانتے ہیں کہ اس زمانہ کا معیار تعلیم کیا تھا اور ہمارے زمانہ سے کس قدر مختلف تھا؟ پھر ساغر نظامی کو تو اپنے عہد کے عظیم ترین سیاسی اور ادبی دانشوروں کی صحبت میسر ہوئی تھی، لہٰذا انہوں نے تعلیم کی اس کمی کو اعلیٰ صحبتوں کے ذخیرہ سے پُر کیا۔ اس کا اندازہ ساغر کے اس بیان سے ہوتا ہے :

''مولانا ابوالکلام آزاد آنند بھون کے بالائی کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اپنے معمول کے مطابق علی الصبح بیدار ہوتے تھے۔ وہ تقریباً پانچ بجے میرے کمرہ میں تشریف لاتے تھے اور پھر مجھے لے کر آنند بھون کے لان پر سورج نکلنے تک ٹہلتے رہتے تھے۔ اس دوران وہ اکثر فارسی شعراء کا کلام سناتے تھے اور ایک بزرگانہ تبسم کے ساتھ

---

[1] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۴۷

[2] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۱۲۴

فرماتے، آپ کو معلوم ہے آپ کے نام پر فارسی میں کتنی شاعری ہوئی ہے، تاکہ مجھے یاد رہے۔ ایک صبح لفظ ساغر پر مولانا ابوالکلام آزاد نے تقریباً ڈیڑھ سو شعر سنائے، نہ صرف سنائے بلکہ محاکات اور ان کے مطالیب پر وہ گوہر افشانی کی جس کا میں صرف تصور کر سکتا ہوں بیان نہیں کر سکتا۔"[1]

ساغر نظامی کا یہ بیان یہ ثابت کرتا ہے کہ انہیں اہل علم وادب کی صحبت میسر تھی اور انھوں نے اپنی رسمی تعلیم کی کمی کو ان صحبتوں کے فیض سے مالا مال کیا اور اُردو کو شکنتلا، انارکلی، نہرو نامہ اور مشعل آزادی جیسی عظیم ترین تخلیقات سے مالا مال کیا۔

ادبی مشاغل

ساغر نظامی کی شعر گوئی کا آغاز کب ہوا اس سلسلہ میں ان کے سوانح نگاروں اور ناقدین فن کی آراء مختلف ہیں۔ اس سے قبل کہ ساغر نظامی کی شعر گوئی کا آغاز کب ہوا۔ اس سلسلہ میں گفتگو کی جائے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے جو ساغر نظامی کی شعر گوئی کا محرک رہا۔ ساغر نظامی کی پیدائش علی گڑھ جیسے مردم خیز شہر اور دانشوروں کی بستی میں ہوئی۔ گو شاعری ایک فطری شے ہے اور اس میں انسان کے خارجی حالات کا اثر اس کے مزاج اور شخصیت پر بھی پڑتا ہے مگر شاعری خالصاً ایک داخلی عمل ہے جو انسان کی شخصیت اور اس کی فکر کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے لیکن خارجی محرکات اس آنچ کو ہوا دیتے ہیں اور پھر یہ آگ انسان کی شخصیت کو زندگی کی بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔

---

[1] سمن پرکاش شوق سے انٹرویو، مطبوعہ روزنامہ 'تیج' ۲۱/اپریل ۱۹۵۴ء

لیکن ماحول اور اس کے اثرات کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ساغر نظامی اپنے ایک ٹی۔ وی انٹرویو مورخہ ۲۳/دسمبر ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر خلیق انجم کے ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں :

"وہ شاعروں کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے انھیں شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔" [۱]

مگر میں یہاں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ورثہ ہمیشہ اپنے آباء واجداد کا ہوتا ہے اور ساغر نظامی کے خاندان میں نہ ان کے دادا شاعر تھے اور نہ ان کے والد گرامی۔ البتہ ننیہال کی طرف سے وہ اس معاملہ میں واقعی شعر و شاعری کی ایک مستحکم روایت کے امانت دار تھے۔ ان کے چار حقیقی ماموؤں میں سے تین بہت مشہور شاعر تھے - عابد رضا خاں جمال صابری، حامد رضا خاں تبسم نظامی اور زاہد رضا خاں کباب علیگڑھی جو علی گڑھ میں عرصہ دراز تک طنز و مزاح کی محفلیں سجائے رہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں شعر و ادب کے کئی پارکھ اور اساتذہ علی گڑھ میں موجود تھے جن میں قمر جلال وی، استاد یوسف، ہادی مچھلی شہری اور دوسرے کئی بزرگان شعر و سخن موجود تھے۔ ساغر نظامی ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان پر بھی صحبت کا اثر ہوا ہوگا اور اس طرح ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی ہوگی۔

دراصل اس پس منظر کا بیان کرنا یوں بھی ضروری تھا کہ ساغر نظامی کی شاعری کے سرچشمے اور ان کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا جاسکے۔ ساغر نظامی کی شاعری کا آغاز کب

---

[۱] ٹی وی انٹرویو، تاریخ نشر ۲۳/دسمبر ۸۲ء، دہلی

ہوا؟ 'بادۂ مشرق' کے دیباچہ میں خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں :

''نو سال کی عمر سے شعر کہنے کا ذوق ہوا، بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں میرے ہاتھ پر میرے مکان 'علی منزل' میں مرید ہوئے اور اسی وقت سے ساغرنظامی نام مشہور ہوا۔'' [1]

اسی سلسلہ میں ایک اور بیان مالک رام کا بھی ہے :

''انھیں شاعری کا ذوق بہت کم عمری میں پیدا ہوگیا، یہی کوئی تیرہ چودہ برس کا سن تھا کہ شعر کہنے لگے۔'' [2]

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں دو باتیں واضح ہوکر سامنے آتی ہیں۔ اول یہ ساغرنظامی کو شاعری کا ذوق بہت کم عمری میں پیدا ہوگیا تھا، یہی کوئی نو دس برس کی عمر میں اور تیرہ چودہ برس کی عمر میں وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے۔ اس سلسلہ میں رحمان نیر 'بیسویں صدی' میں لکھتے ہیں :

''انھوں نے تیرہ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا تھا [3]

مجھے برباد کرکے باغباں چاہے جہاں پھینکے
میں سبزہ بن کے پھر اُگ آؤں گا صحن گلستاں میں

اس شعر سے ساغر نظامی کے اس لہجے اور رویہ کی مہک آتی ہے جو بعد میں ان کی شخصیت کا امتیازی وصف بن کر ابھرا۔

---

[1] دیباچہ 'بادۂ مشرق'، صفحہ ۳۷۵، مشمولہ 'ساغرنظامی : فن اور شخصیت'

[2] ساغرنظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۴۷

[3] بیسویں صدی، اپریل ۱۹۸۴ء، صفحہ ۲۲

اس طرح اردو کے ایک عظیم فن کار کا تخلیقی سفر شروع ہوا جسکا انتظار اس کا شاندار مستقبل کر رہا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ہونہار شاگردوں کی تربیت اور ان کے جوہر کو نمایاں کرنے کے لئے کسی ماہر فن استاد کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ فطری صلاحیت، قابلیت اور محنت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم مگر رہنما کے بغیر منزل کا تصور بھی محال ہے اور چونکہ علی گڑھ سے آگرہ بہت قریب تھا اور وہاں اس عہد کے ممتاز شاعر علامہ سیمابؔ اکبر آبادی شاگرد داغ دہلوی نو واردان بساط شاعری کی تہذیب و تربیت کا بار سنبھالے ہوئے تھے۔

اس سے قبل کہ ساغرؔ نظامی سے سیماب اکبر آبادی سے تعلق اور رسم شاگردی پر گفتگو کروں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ سیماب سے متعلق ناقدین کی آرا بیان کرتا چلوں۔

ظ۔ انصاری اپنے مضمون ''ساغر نظامی جو اپنا کام کر گئے'' میں لکھتے ہیں :

''علی گڑھ سے آگرہ قریب تھا اور اس علاقہ میں ایک ہی استاد سیماب اکبر آبادی ایسا تھا جو بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں سے باخبر موضوعات میں تازہ شعر کے دھارے کو حالات کی طرف موڑ دینے کے لئے بےچین اور ادبی مشقت کو کل وقتی باضابطہ پیشہ بنائے ہوئے اپنے ماہناموں اور شاگردوں کا حلقہ بڑھائے جا رہا تھا۔'' [1]

مالک رام سیماب اکبر آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں :

''یہی زمانہ ہے کہ جب مولینا عاشق حسین سیمابؔ اکبر آبادی کا دنیائے شعر میں ڈنکا بج رہا تھا اور نوجوان طبقہ ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے اور اپنے تخلص کے ساتھ سیماب کا لاحقہ شامل کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ ساغر نظامی نے

---

[1] ساغر نظامی جو اپنا کام کر گئے، ماہنامہ آجکل، ستمبر ۸۴ء، صفحہ ۱۷

بھی سیماب کی شاگردی اختیار کی اور سیمابی کہلانے لگے۔'' [1]

ان دو حضرات کے بیان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیماب اس عہد کے ممتاز شاعر تھے اور ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونا نو آموز شعرا کے لئے فخر کی بات تھی۔ اس عہد میں علامہ اقبال کے بعد سیماب اکبر آبادی سب سے زیادہ مقبول اور مستند شاعر تھے۔ سیماب چونکہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس طرح ساغر کا تعلق ادب کے ایک ایسے اسکول سے ہو گیا جو اپنے ادبی وقار اور دبدبہ کے لئے اردو میں آج تک مشہور ہے۔

انھیں دنوں سیماب ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ یہ مشاعرہ ۱۶/ اگست ۱۹۱۹ء کو استاد یوسف تلمذ داغ دہلوی کے یہاں منعقد ہوا تھا اور مشاعرہ سے کچھ دیر قبل ساغر اپنے شاعر دوست کے ہمراہ سیماب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، غزل پیش کی اور رسم شاگردی ادا ہوئی۔ اس سلسلہ میں رازؔ کانپوری لکھتے ہیں :

> ''مشاعرہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے سیماب صاحب کے ایک محبوب شاگرد ضمیر عالم ساحرؔ اکبر آبادی (مقیم علی گڑھ) ہماری جائے قیام پر آئے اور تیرہ چودہ سال کے خوش رو طالب علم کو مع غزل سیماب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ سیمابؔ صاحب نے پہلے ایک نظر کم سن شاعر پر ڈالی اور پھر غزل پر قلم برداشتہ اصلاح کی۔ غزل میں مقطع نہ تھا۔ ساغر صاحب نے بتایا کہ ابھی تخلص تجویز نہیں کیا گیا ہے۔ سیماب صاحب نے میری طرف دیکھا اور میں نے عرض کیا ساحرؔ کا دوست ساغر۔ چنانچہ اسی وقت یہ مقطع موزوں کر کے غزل مکمل کر دی گئی ۔

---

[1] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۴۷

ساغر ہم ان کے سامنے رکھ دیں گے آئینہ
نپٹا کریں گے آپ وہ اپنی نگاہ سے [1]

لالہ سری رام اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۸ء میں سیماب اکبرآبادی کے زمرۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ استاد کی توجہ اور اپنی ذہنی دماغی خداداد قابلیت سے بہت جلد ترقی کر گئے۔" [2]

لالہ سری رام کے بیان کا دوسرا حصہ قابل قدر ہے کہ ساغر نظامی اپنی محنت اور دماغی صلاحیت کی وجہ سے بہت جلد شہرت اور ترقی کے مدارج طے کر گئے، مگر ۱۹۱۸ء میں وہ سیماب کے شاگرد ہوئے۔ اس سلسلہ میں رازؔ چاندپوری کا بیان زیادہ قابل قدر اور ٹھوس ہے کیونکہ انھوں نے تاریخ، مہینہ اور سال بھی تحریر کیا ہے۔ اس طرح ساغر نظامی چودہ برس کی عمر میں سیماب جیسے شہرت یافتہ اور مسلم الثبوت استاد کے شاگرد ہو گئے۔ سیمابؔ صاحب بلاشک وشبہ اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ لہٰذا ساغرؔ نظامی کی ذہنی نشوونما اور تربیت میں ان کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تعلق اس قدر مضبوط ہوگیا کہ ۱۹۲۳ء میں ساغر نظامی علی گڑھ سے سیمابؔ کے پاس آگرہ منتقل ہوگئے۔ حالانکہ ساغر نظامی کم عمر تھے مگر سیماب کو اپنے اس نوعمر شاگرد پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنا دیوان مرتب کرنے کے لئے ساغرؔ کو دے دیا۔ [3]

ٹونڈلہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر سیماب نے آگرہ سے ساغر کی شرکت میں

---

[1] داستان چند، از رازؔ چاندپوری، صفحہ ۱۹

[2] خمخانۂ جاوید، از لالہ سری رام، جلد چہارم، صفحہ ۲۰

[3] داستان چند، صفحہ ۹

ماہنامہ ''پیمانہ'' جاری کیا۔ پیمانہ اس عہد کا ایک معیاری پرچہ تھا جس میں مشاہیر کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح ''پیمانہ'' اس عہد میں جدت اور جدید خیالات کا مبلغ اور آئینہ تھا۔ لہٰذا ''پیمانہ'' کی ہر گردش اسے مقبول تر بناتی رہی۔

مگر اسی دوران ۱۹۲۶ء میں نئے ادبی افق کی تلاش ساغر نظامی کے کچھ کر گزرنے اور کر دکھانے کے رُجحان نیز علامہ تاجور نجیب آبادی کے مشورہ پر سیماب نے اپنا کاروبار آگرہ سے لاہور منتقل کر دیا۔ لاہور میں ساغر کی شرکت میں انھوں نے اپنا ادبی کاروبار جمالیا اور ''پیمانہ'' کی اشاعت بھی وہاں سے ہوئی لیکن صوبائی تعصب نے سیماب اور ساغر کو وہاں جمنے نہیں دیا۔ وہ لوگ جو کل تک ان کی صلاحیتوں کا دم بھرتے تھے سیماب کو اپنے کاروبار کے مدمقابل دیکھ کر صف آرا ہو گئے۔ ساغر اور سیماب نے لاہور سے جو توقعات وابستہ کی تھیں ان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس طرح لاہور میں ذہنی اور جسمانی صعوبتیں اٹھانے کے بعد یہ دونوں لاہور سے آگرہ لوٹ آئے اور پھر یہاں سے ''پیمانہ'' کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا۔ لیکن اب ساغر نے علی گڑھ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور یہیں انھوں نے اپنے ذاتی کاروبار کی بنیاد ڈالی لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیماب صاحب کی معیت میں ساغر نے ایک طرف جہاں نظم و نثر کے رموز سے واقفیت حاصل کی وہیں دوسری طرف ہندوستان کے مشاعروں میں شرکت کر کے دنیائے ادب سے روشناس ہوئے۔ ریاست ٹونک بھی گئے جہاں ریاست کے صاحبزادگان نے انھیں خیام العصر[1] خالق جذبات کے خطابات سے نوازا۔

---

[1] داستان چند، صفحہ ۹۲

ساغر نظامی کی نایاب نظم 'ماضی' - تجزیاتی مطالعہ

علی گڑھ کو اپنا مستقر بنانے کے بعد ساغر نظامی نے تنہا اپنی ادبی جدو جہد کو جاری رکھا اور ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ ہی سے ایک ہفتہ وار "علی گڑھ پنچ" کے نام سے جاری کیا جس میں تقریباً تمام مضامین مزاحیہ ہوتے تھے۔

ان ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ساغر نظامی کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی کیونکہ وہ زمانہ جدوجہد آزادی کا تھا۔ انگریز سختی سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے شعلوں کو بجھانا چاہتے تھے، کانگریس گاندھی جی کی قیادت میں واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی، ملک خلافت تحریک کے دوران ہندو مسلم اتحاد کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ساغر نظامی کی شاعری میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے شاعری کے ساتھ ساتھ ساغر کی سیاسی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ ان کی سیاسی سمجھ اور جدوجہد کا اظہار ماہنامہ "مستقبل" کے روپ میں ہوا۔ اس رسالہ میں تمام تر سیاسی مضامین ہوتے تھے مگر ساغر کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور صرف ایک نمبر کی اشاعت کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ مگر ساغر کے پایۂ ثبات میں لغزش نہیں آئی اور وہ ۱۹۲۹ء میں پھر ہفت روزہ "استقلال" کے ساتھ نمودار ہوئے۔

اسی دوران ساغرؔ کے والد جو محکمہ صحت میں داروغہ تھے کا تبادلہ علی گڑھ سے مظفر نگر ہو گیا اور ساغر نظامی اپنے والد کے ہمراہ مظفر نگر منتقل ہو گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد تبادلہ میرٹھ ہو گیا اور ساغر بمع خاندان میرٹھ چلے آئے۔ اب انھوں نے اپنے تمام ادبی کاموں کا مرکز میرٹھ کو بنا لیا۔ میرٹھ کے قیام کا زمانہ ساغر نظامی کی ادبی فتوحات کا زمانہ ہے۔ یہاں رہ کر انھوں نے بڑے بڑے ادبی کارنامہ انجام دئے۔ ادبی مرکز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور ساغر پریس کے نام سے ایک مطبع بھی کھولا۔ یہیں سے انھوں نے ۱۹۳۴ء

میں اپنے افسانوں کا مجموعہ کہکشاں بھی شائع کیا اور یہیں سے ان کا مشہور مجموعۂ کلام ''بادۂ مشرق'' بھی شائع ہوا۔ لیکن ''کہکشاں'' کے دیباچے سے مولینا سیماب اور ساغر نظامی کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی چلی گئی۔ کہکشاں کے دیباچہ نگار مولوی عنایت علی رضوی نے ساغر کے طرز بیان اور افسانوی اسلوب کو لارڈ میکالے رابرٹ اسٹی وینسن جے کے چسٹرٹن کے معیار کا بتایا تھا۔ یہاں تک تو پھر بھی گنجایش تھی مگر رضوی صاحب نے جب یہ لکھا کہ ساغر کی شہرت، قابلیت اور ذہانت میں کسی دوسرے کی مدد کا ہاتھ نہیں تھا تو مولینا سیماب کو یہ خیالات بہت ناگوار گزرے اور انھوں نے ۳/ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو راز چاند پوری کے نام اپنے مکتوب میں اس ناگواری کا اظہار کیا :

> ''شاید آپ نے کہکشاں کا دیباچہ نہیں پڑھا۔ اگر پڑھ لیا ہے تو کیا میری عمر بھر کی خدمات کا صلہ یہی ہے کہ جو مجھے ساغر کی طرف سے مل رہا ہے۔'' [۱]

لیکن ساغر نے خود کو ان تنازعات کی زد سے بچائے رکھا اور اپنی ادبی جدو جہد میں لگے رہے۔ ایک خط میں راز چاند پوری کو لکھتے ہیں :

> ''جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہ تھا وہ سامنے آ رہی ہیں ۔ میں حتی الامکان خاموش رہوں گا کیونکہ میرا ضمیر اپنے محسن قدیم سے اس قسم کی لڑائی کرنے کی تائید میں نہیں ہے۔'' [۲]

دراصل ساغر نظامی اور سیماب اکبر آبادی کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ سیماب اکبر آبادی کے مرتبہ ان کے فکر و فن اور ان کی اعلیٰ قابلیت پر شک کرنا کفر کے

---

[۱] داستان چند، صفحہ ۹۵

[۲] داستان چند، صفحہ ۹۶

مترادف ہے مگر مولینا کی زندگی میں تنظیم و ترتیب کا فقدان تھا جبکہ ساغر بیحد موقع شناس، زندگی میں تنظیم و قوانین کے پابند تھے۔ جبکہ سیماب نے اپنے آپ کو اس قدر پھیلا لیا تھا کہ وہ کسی ایک کام پر اپنی توجہ پوری طرح مرکوز نہیں کر سکتے تھے لیکن ساغر نظامی ایک وقت میں ایک کام پوری تن دہی لگن اور محنت سے کرنا چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ سیماب کو ساغر سے شکایت ہوئی کہ وہ اپنی دنیا الگ بنا رہے ہیں، لیکن ساغر نظامی نے ہمیشہ اپنے محسن قدیم اور استاد کو عزت و احترام سے یاد کیا اور اپنی ادبی جدوجہد کے سفر کو جاری رکھا۔ میرٹھ کے قیام کا زمانہ ان کی زندگی کا سنہری دور کہا جائے گا۔ یہیں سے جولائی ۱۹۳۴ء میں اردو کے مشہور ماہنامے ''ایشیا'' کا اجرا عمل میں آیا جو ۱۹۵۰ء تک باقاعدگی کے ساتھ شعر و ادب اور ملک و قوم کی خدمت میں مشغول رہا۔ ساغر اپنا ادبی کاروبار میرٹھ میں جما چکے تھے کہ اسی دوران ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی کو بمبئی کی فلمی دنیا سے ''گیت اور مکالمے'' لکھنے کی پیش کش ہوئی اور اردو کے یہ دونوں بڑے شاعر بمع ساز و سامان پونہ پہنچ گئے۔

یہاں وہ شالیمار پکچرس کے سینیر یو ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں انھوں نے بمبئی میں متعدد فلمی گیتوں اور مکالموں پر کام کیا۔ ان کی فلموں میں من کی جیت، مہندی، بھول اور لاج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مگر ساغر جو سوچ کر فلمی دنیا میں آئے تھے اور یہاں آنے سے قبل جس طرح کے انقلابی خواب انھوں نے دیکھے تھے ان کی تکمیل بمبئی کی مطلب پرست اور منافع بخش دنیا میں ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھی۔ لہٰذا ساغر اس بڑے شہر میں بھی گھٹن محسوس کرنے لگے۔

ملازمت

ملک آزاد ہو چکا تھا۔ ساغر نظامی نے جن سیاسی رہنماؤں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر جنگ آزادی لڑی تھی وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کے مربی اور مہربان آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے سامنے آ چکے تھے۔ مگر ساغر نے کسی کے آگے کبھی دست سوال دراز نہیں کیا۔ پنڈت نہرو جب نیوی ڈے کے سلسلہ میں بمبئی تشریف لے گئے اور انھیں ساغر نظامی کے حالات کا علم ہوا تو انھوں نے ساغر کو آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کی پیش کش کی۔ ساغر نظامی اپریل ۱۹۵۰ء میں لٹریری ایڈوائزر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور کچھ دن بعد ہی انھیں پروڈیوسر بنا دیا گیا۔ بعد میں وہ ڈپٹی چیف پروڈیوسر کے عہدہ تک پہنچے۔ مجموعی طور پر ساغر نظامی نے پندرہ برس تک ریڈیو کی ملازمت کی اور اس دوران انھوں نے ''شکنتلا''، ''نہرو نامہ''، ''مشعل آزادی'' جیسی منظوم تخلیقات سے اردو کے دامن کو مالا مال کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد نظمیں، فیچر نثری ڈرامے، کہانیاں اور تقریریں بھی لکھیں۔

یکم جنوری ۱۹۷۳ء کو حکومت ہند نے ساغر نظامی کی صلاحیتوں سے فیض اٹھانے کا ایک اور موقع نکال لیا اور انھیں پبلکیشن ڈویژن میں O.S.D. کی حیثیت سے مامور کیا اور ساتھ میں ہندوستان کی تحریک آزادی پر رزمیہ لکھنے کا کام انھیں سونپا جسے ساغر نظامی نے ''مشعل آزادی'' کے نام سے پیش کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ساغر نظامی کو حکومت ہند نے Poet in Residence کے اعلیٰ منصب سے سرفراز کیا اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا مشیر بھی انھیں بنایا گیا۔ قیام دہلی کا زمانہ ساغر نظامی کے تخلیقی سفر کا بہترین دور ثابت ہوا۔ یہیں انھوں نے

۱۹۶۰ء میں کالیداس کے مشہور سنسکرت ڈرامے ''شکنتلا'' کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ ۱۹۶۳ء میں انارکلی کے قصہ کو منظوم صورت عطا کی اور جدید ہندوستان کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو کی حیات اور فکر کو ''نہرو نامہ'' کی شکل میں ۱۹۶۷ء میں پیش کیا۔

غیر ممالک کا سفر

ساغر نظامی نے اپنی ادبی مصروفیات کے سلسلہ میں دو مرتبہ غیر ممالک کا سفر بھی کیا۔ انھیں دو مرتبہ حکومت ہند نے ادبی، تہذیبی اور خیر سگالی وفود میں غیر ممالک بھیجا۔ پہلی مرتبہ وہ ۳/نومبر ۱۹۵۵ء کو پولینڈ کے شاعر اعظم ''ادم متسکے وچ'' کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لئے حکومت ہند کے نمائندے کی حیثیت سے وارسا گئے۔ اس تقریب میں پینتیس (۳۵) ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اردو کے نمائندے کی حیثیت سے ساغر نظامی نے اور ہندی کی نمائندگی رام دھاری سنگھ دنکر نے کی۔ اس سفر کے دوران ساغر نظامی کو لندن، پیرس، جنیوا، روم اور کیرو جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ دوسری مرتبہ وہ ۴/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو حکومت ہند کے ایک پنچ لسانی وفد میں اردو زبان کے نمائندے کی حیثیت سے روس گئے۔ یہاں ساغر نظامی نے روس کی مختلف ریاستوں کے تمدنی اور تہذیبی ارتقا کا جائزہ لیا۔ وہ اکیس (۲۱) دن تک روس میں رہے۔ اس دوران انھوں نے روسی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ وہاں کی ادبی روایتوں کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی کیا۔

ظ۔ انصاری روس میں ساغر سے ملاقات کا حال کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''افسوس ظ۔ انصاری صاحب ہم نے یہ دنیا اتنی دیر سے دیکھی۔ یہاں تو

قدم قدم پر............ کیا صاف ستھرے شہر ہیں، کیا دلرُبا نقشے ہیں، علم کی گرم بازاری ہے اور ایک ہم وہاں اپنی ڈفلی بجاتے رہے۔" [1]

عائلی زندگی

۲۸/ مارچ ۱۹۴۳ء کو ساغر نظامی ذکیہ سلطانہ نیر سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ذکیہ سلطانہ نیر خود بھی اچھی شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ ذکیہ سلطانہ کے والد ماجد مولوی عبدالہدیٰ خاں مراد آباد کے مشہور وکیل اور زمیندار تھے۔ ان کا خاندان کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ مولوی عبدالہدیٰ خاں کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ ذکیہ سلطانہ ان کی دوسری اولاد ہیں۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ گھر کا ماحول چونکہ ادبی تھا اس لئے گھر میں بہت سے ادبی رسائل آتے تھے۔ انھیں میں ساغر نظامی کا ایک ماہنامہ 'ایشیا' بھی تھا۔ ذکیہ سلطانہ نیر کی تخلیقات اس پرچہ میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ قلمی تعاون رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے واقفیت کا سبب بنا کیونکہ ذکیہ سلطانہ نیر ساغر نظامی کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کی بھی مداح تھیں۔ ساغر نظامی کے متعلق لکھتی ہیں :

"شادی سے پہلے میں پردہ میں رہتی تھی لیکن شاعری سے مجھے بچپن ہی سے لگاؤ تھا، ساغر میرے پسندیدہ شاعروں میں سے تھے۔ ان دنوں ساغر نیشنل

---

[1] ساغر نظامی جو اپنا کام کر گئے، ماہنامہ آجکل، صفحہ ۱۷

موومینٹ کی تحریک سے وابستہ تھے اور ایک رسالہ ایشیا شائع کرتے تھے۔ میں اس
رسالہ کی سالانہ خریدار تھی اور ساغر کی کتابیں خرید کر پڑھتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں
شادی سے قبل ہی مجھے ان سے بحیثیت شاعر ایک قلبی لگاؤ تھا۔'' [1]

لیکن جب ساغر نظامی نے ذکیہ سلطانہ کے لئے اپنا پیغام بھجوایا تو ان کے خاندان والوں نے اسے نامنظور کر دیا لیکن ذکیہ سلطانہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہیں اور ان کی ضد کے آگے ان کے خاندان والوں کو بھی جھکنا پڑا۔ یہ شادی جس قدر کامیاب رہی اس کی مثال ادیبوں اور شاعروں کی زندگی میں مشکل سے ملے گی۔ حالانکہ بیگم ذکیہ سلطانہ ساغر نظامی سے انیس برس چھوٹی تھیں۔

بیگم ذکیہ ساغر کے بطن سے ایک بیٹی اور تین بیٹے تولد ہوئے۔ بڑی بیٹی شہناز ''دوبئ'' میں ملازم ہیں اور اپنے شوہر کے ہمراہ وہیں رہتی ہیں، بیٹے سکندر اقبال یار خاں، بابر اقبال یار خاں اور اکبر اقبال یار خاں تینوں اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ اول الذکر دونوں ''دوبئ'' میں ملازمت کرتے ہیں اور تیسرے اکبر اقبال یار خاں دہلی میں گارمینٹس کی فیکٹری چلاتے ہیں۔

---

[1] ماہنامہ بیسویں صدی، صفحہ ۲۲، اپریل ۱۹۸۴ء

اعزازات و انعامات

''پدم بھوشن'' کا اعزاز

جنوری ۱۹۶۹ء میں ساغر نظامی کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں بھارت سرکار نے پدم بھوشن کا اعزاز عطا فرمایا اور خلد آشیانی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے سند مرحمت فرمائی۔

''ہمدرد ایوارڈ''

۱۹۸۰ء میں بزم ساز و ادب، دہلی کی طرف سے ''ہمدرد ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

''امتیاز میر ایوارڈ''

آل انڈیا میر اکیڈمی، لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۸۱ء میں ساغر نظامی کو ''امتیاز میر ایوارڈ'' دیا گیا۔

''غالب مودی ایوارڈ''

۶ر جولائی ۱۹۸۴ء کو بعد از مرگ ساغر نظامی کو یہ ایوارڈ سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے مرحمت فرمایا تھا۔

وفات

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ کائنات فانی میں جنم لینے والی ہر شے کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ساغر نظامی زندگی کی انیاسی (۷۹) بہاریں دیکھ چکے تھے، لیکن ان کی صحت اور رکھ رکھاؤ قابل دید تھا۔ لیکن کون جانتا ہے کب کس کا بلاوا آجائے۔ موت سے چند ماہ قبل ہی انھوں نے آل انڈیا رائٹرس اور جرنلسٹ فورم کے زیر اہتمام کل ہند قومی یکجہتی کانفرنس منعقد کی تھی۔ یکا یک سر درد کی شکایت نے ڈاکٹروں سے رجوع کرنے پر مجبور کیا۔ ڈاکٹروں نے ہڈیوں کا کینسر تشخیص کیا۔ ان کو بہترین سے بہترین علاج فراہم کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب راقم التحریر کا بھی ساغر نظامی کے یہاں آنا جانا تھا اور ساغر صاحب بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو ان کی ۷۸ ویں سالگرہ ان کے مکان واقع پنڈارہ روڈ پر بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ راقم التحریر بھی وہاں موجود تھا اور ساغر نظامی کو گلدستہ پیش کیا تھا۔ اس دن ان کے یہاں اردو کے تمام چھوٹے بڑے ادیب موجود تھے جن میں پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ حسن ثانی نظامی، گلزار دہلوی، پروفیسر عنوان چشتی سب نے ساغر کے فکروفن پر گفتگو کی تھی۔ ساغر نے اپنی جذباتی تقریر میں اپنی شریک حیات ذکیہ سلطانہ نیر کو مریم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ ساغر نظامی اب صحت یاب ہو گئے ہیں لیکن ۷ر فروری ۱۹۸۴ء کو ان کی حالت زیادہ نازک ہو گئی۔ اس دن میں بھی وہاں موجود تھا۔ ساغر

صاحب بہت دیر تک پرانی یادیں دوہراتے رہے اور اکثر درمیان میں روبھی پڑتے تھے۔ ۲۳؍فروری ۱۹۸۴ء کو وہ بہت کم گفتگو کر پا رہے تھے۔ میں نے انھیں بتایا تھا کہ اب کئی روز بعد حاضر ہوسکوں گا کیونکہ میرٹھ یونیورسٹی کے ایک سیمینار کی تیاری کے سلسلہ میں وہاں جانا ہے، لیکن یہ احساس نہیں تھا کہ اب ساغر صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ ۲۷؍فروری ۱۹۸۴ء کو مجھے پروفیسر محمد حسن اور ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کے ہمراہ میرٹھ پہنچنا تھا کہ یہ دل دوز خبر ملی۔ ان دونوں حضرات کو برادرم جلال انجم کے سپرد کر کے میں ساغر صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچا مگر وہاں اب ''ساغر'' کے نام کی تختی تو موجود تھی مگر دروازہ پر استقبال کرنے والے اور اس کی دل نواز مسکراہٹ کی جگہ موت کی خاموشی تھی۔ ۲۸؍فروری ۱۹۸۴ء کو ان کا جنازہ اٹھا اور نظام الدین میں نواب الٰہی بخش کے خاندانی قبرستان میں غالب سے محض چند گز کی دوری پر ابدی قیام گاہ میں محو خواب ہو گئے۔ نماز جنازہ خواجہ حسن ثانی نظامی نے پڑھائی۔ ساغر کے انتقال پر ملال کی خبر سے ملک کے تمام ادبی اور سیاسی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ غالب اکیڈمی میں ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والے جلسہ کو تعزیتی جلسہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا :

''ساغر نظامی ایک عظیم محب وطن اور اُردو کے مشہور دانشور تھے۔ انہوں نے شعر وسخن کے ذریعہ گہری محبت کا اظہار کیا اور لوگوں کے دلوں کے اندر حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا۔'' [1]

وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی اپنے رنج وغم کا اظہار ان الفاظ میں کیا :

---

[1] ہفت روزہ 'نئی دنیا'، دہلی، ۲۰ تا ۲۶؍مارچ ۱۹۸۴ء

ساغر نظامی کی نایاب نظم 'ماضی' - تجزیاتی مطالعہ

''ساغر نظامی پکے قوم پرست تھے۔ ان کی شاعری وطن کی محبت کا پیغام ہے جس کے ذریعہ انہوں نے حب الوطنی اور سیکولر نظریے کو فروغ دیا۔ ان کی موت سے اردو ایک محسن سے محروم ہوگئی۔'' [1]

ساغر نظامی کی وفات پر متعدد تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے۔ اردو کے بیشتر اخبارات نے جلی سرخیوں میں ساغر نظامی کی وفات کی خبر شائع کی۔ ذیل میں کچھ اخبارات کی سرخیاں پیش کی جاتی ہیں :

''اور ساغر ٹوٹ گیا''

ہفت روزہ 'نئی دینا' دہلی، ۲۰ تا ۲۶ / مارچ ۱۹۸۴ء

''جوش و فراق کے سلسلہ کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی''

ماہنامہ 'بیسویں صدی' اپریل ۱۹۸۴ء

''ساغر نظامی : ایک آواز جو خاموش ہوگئی''

ماہنامہ فلمی ستارے، مارچ ۱۹۸۴ء

''ایک محب وطن شاعر اور چلا گیا''

ہفت روزہ 'بلٹز'، بمبئی، ۱۰/ مارچ ۱۹۸۴ء

اس کے علاوہ بہت سے شاعروں نے ساغر نظامی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر مغیث الدین فریدی اور قمر سنبھلی نے تاریخ وفات بھی کہی۔ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں

بزم سخن سے رخصت ہوئی ہے جادو نوائی شیریں کلامی

---

[1] ہفت روزہ 'نئی دنیا' نئی دہلی، ۲۰ تا ۲۶ / مارچ ۱۹۸۴ء

ہے ختم دور جام صبوحی کیسے مٹے گی اب تلخ کامی
اردو زباں کا مطرب تھا ساغر روشن رہے گا یہ نام نامی
جرعہ جو چھینا دست اجل نے تاریخ نکلی ساغر نظامی [1]

اٹھ گئے آج دنیا سے ساغر
بزم شعروسخن ہے سیاہ پوش
سال غم لکھ قمر عیسوی میں
ہوگئی شمع شعر آہ خاموش [2]

....

ساغر کی ذھنی تربیت کے داخلی اور خارجی سرچشمے

کسی بھی انسان کی شخصیت متضاد عناصر کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان کی شخصیت کے داخلی اور خارجی دو پہلو ہوتے ہیں اور ان دونوں پہلوؤں کی ترتیب، تہذیب اور نظم وضبط سے ایک مکمل شخصیت کا ظہور ہوتا ہے۔ ساغر نظامی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ساغر کی شخصیت میں جھانکنے کے لئے ان داخلی اور خارجی عوامل کی

---

[1] ساغر نظامی : فن اور شخصیت، صفحہ ۷۹

[2] روزنامہ 'الجمعیۃ'، ۲۹ رفروری ۱۹۸۴ء

نشاندہی نہایت ضروری ہے جن کی وجہ سے وہ عظیم بن سکے۔ ساغر کا بچپن علی گڑھ کے قریب ایک گاؤں ''سومنہ'' میں گزرا۔ شکنتلا کے دیباچہ میں ساغر نے بچپن کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے

''میرا بچپن اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں سومنہ میں گزرا۔ اس گاؤں میں مشکل سے پچاس گھر ہوں گے، ایک مسجد، ایک مندر اور شاہراہ اعظم کے کنارے آموں کا باغ۔ باغ کے چاروں طرف گیہوں، سرسوں، جو اور چنے کے کھیت۔ ان کھیتوں سے ہم آغوش ہرے بھرے میدان اور میدانوں میں چھوٹی چھوٹی پھوکریں۔'' [1]

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

''اور جھیل کے کنارے وہ لہلہاتے کھیت جن میں سرسوں کے پھول زمین سے ادھر ایک پیلے رنگ کی چادر تان لیتے تھے اور ان کھیتوں میں لال پیلی چولیاں کسے گاؤں کی ناریاں نمودار ہوتی تھیں۔ کولھوں پر گاگریں اٹھائے ہاتھوں میں گڑھیاں لئے وہ آتیں اور کیاریوں میں پانی دیکر کنوئیں پر لوٹ جاتیں۔ جاتے جاتے کوئی ان میں سے بے تحاشا ہنس پڑتی اور بے محابا مٹھی بھر موتی میرے منہ پر مار کر چلی جاتی اور میں دیکھتا رہ جاتا، کچھ نہ سمجھ سکتا۔'' [2]

ساغر نظامی کے یہ جذبات اس بات کی طرف نشان دہی کرتے ہیں کہ ان کی ابتدائی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو سرتاسر رومانی تھا۔ تالاب کا کنارہ، کھلے ہوئے کنول، کولھوں پر گاگریں ان کے رومانی مزاج کو بڑھاوا دینے کے لئے کافی تھے اور اس

---

[1] شکنتلا، صفحہ ۱۴

[2] شکنتلا، صفحہ ۱۵

بات سے انکار شاید ہی کسی کو ہو کہ ساغر نظامی بنیادی طور پر رومانی طرز احساس کے شاعر تھے۔

ساغر نظامی کا بچپن جس ماحول میں گزرا وہاں انسان کو انسان سمجھا جاتا تھا۔ ان کے اردگرد کا ماحول ہر طرح کے مذہبی تعصب سے پاک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ساغر نظامی کی تخلیقات خواہ وہ شعری ہوں یا نثری ان میں ہر جگہ قومی یک جہتی اور مذہبی رواداری نظر آتی ہے۔ ان کے نزدیک مذہب اتفاق کے لئے تھا، نفاق کے لئے نہیں۔ مذہب کو وہ انسان کی جبلتِ حیوانی کو مٹانے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے کیونکہ مذہب کسی مخصوص حلقۂ فکر میں قید ہونے والی شے نہیں ہے۔ اپنے بچپن کا حال لکھتے ہیں :

> ''مسجد میں بستی کے مسلمان آ کر نماز پڑھتے اور جب باہر نکلتے تو ایک شناسا گاؤں کے ٹھاکر سے پوچھتا کچھ میرے لئے بھی خدا سے دعا مانگی۔ مندر میں پوجا پاٹ کے بعد لوگ باہر آتے تو ایک مسلمان بچہ کو لئے کھڑا ملتا، ''جی اس بیمار بالک پر تو پھونکتے جاؤ۔ میں ان باتوں سے انجان تھا۔ مجھے نفرت چھوت چھات اور دھرم ادھرم کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں تو جس گھر میں جی چاہتا چلا جاتا۔ ہندو کے گھر میں مسلمان کو اور مسلمان کے گھر میں ہندو کو دیکھتا اور اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ، جن میں امیر غریب، برہمن، ویش، کھتری سبھی کے بچے ہوتے اسکول جاتا۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتباسات کو پیش کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ ایک عظیم فن کار کی تربیت کے داخلی اور خارجی سرچشموں کی نشان دہی کی جا سکے۔ ساغر نظامی کے بچپن کا علیگڑھ اور کل ہندوستان خلافت تحریک کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ گاندھی جی کو سارے

---

[1] شکنتلا، صفحہ ١٦

ہندوستانیوں نے اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا اور خلافت تحریک کی کمان بھی انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ قومی یکجہتی کی جیسی نادر مثالیں بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں دیکھنے کو ملیں اس کا تصور بھی اس صدی کی آخری دہائی میں نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں ہر طرف مذہبی منافرت نے انسانی جانوں کو کس قدر ارزاں کر دیا ہے۔ ساغر نظامی کا شعور جوان ہوا تو ملک جدوجہد آزادی میں مصروف تھا۔ ساغر نظامی نے اپنی نظموں سے جنگ آزادی کی تحریک کو گرم رکھا۔ ملک کے صفحۂ اول کے رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، مولینا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سید محمود سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو بذاتِ خود ان کی مداح تھیں اور انہیں اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔

ساغر نے زندگی کے بیشتر حصے میں مصائب برداشت کیے۔ ایشیا کی اشاعت اور اسے جاری رکھنے میں صعوبتیں برداشت کیں مگر کبھی اپنے محور سے نہیں ہٹے۔ اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

> "میں جانتا ہوں کہ اگر ایشیا کی بجائے آٹھ سو روپے ان تین ماہ میں ایک تانگہ بنانے میں صرف کیے جاتے تو اس وقت تانگہ بھی ہوتا اور اس سے آمدنی کا سلسلہ بھی مگر رسالہ کے جتنے وی۔ پی گئے پچھتر فیصد واپس آ رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ شاید سو روپے بھی اس ماہ میں آمدنی نہ ہوگی مگر مجھے یہ حق نہیں کہ میں ناراض ہوں کیونکہ مجھ سے کسی نے آکر ہاتھ نہیں جوڑے تھے کہ آپ رسالہ نکالیے اور شاعری فرمایئے۔ میرا فرض ہے اور اس کے اثرات مابعد کا میں خود ہی ذمہ دار ہوں۔ میں ادبی دق میں مبتلا ہوں یا دق رہے گی یا میں یا دونوں غائب۔" [1]

---

[1] ہم عصر شعرا کے خطوط، مرتب ضیاء الاسلام، صفحہ ۱۰۰

لیکن ساغر نظامی نے زندگی میں کبھی یک جہتی، مذہبی رواداری اور ہندوستان ارم نظیر کے لئے خوشگوار جمہوریت کے جو خواب دیکھے تھے اور وہ تا حیات انہیں اصولوں پر کاربند رہے۔ اپنی بات ختم کرتے ہوئے ان کی تقریر کا ایک اور اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جو انہوں نے آل انڈیا اردو رائٹرز اور جرنلسٹ فورم کے زیر اہتمام کانفرنس برائے قومی یکجہتی کے تاریخ ساز اجلاس مورخہ ۶، ۷/ستمبر ۱۹۸۳ء کو کی تھی۔

''ہم اپنی آزادی کو اس وقت بچا سکتے ہیں جب قومی اتحاد ہو، قومی اتحاد ہندوستان کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔''[1]

••••

---

[1] ہفت روزہ 'مگدھ پنچ'، ۱۶/ستمبر ۱۹۸۳ء

کا تجزیاتی مطالعہ

''ماضی''

''ماضی'' ساغر نظامی کی طویل نظم ہے جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان دہلی میں لکھی گئی۔ یہ نظم غیر مطبوعہ ہے جو خود ساغر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا سرنامہ انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں لکھا ہے۔ فل اسکیپ سائز کے ۵۷ صفحات پر یہ نظم پھیلی ہوئی ہے۔ شاعر سب سے پہلے اپنے آپ سے سوال کرتا ہے ؂

جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں
جانے کیوں ماضی پر مرتا ہوں

....

اس کے بعد انھوں نے ماضی کو دیوی سے خطاب کیا ہے اور اسے امر کنول کی امر مہک بتایا ہے۔ جس بحر میں یہ نظم کہی گئی ہے اس کا پہلا مصرع دوسرے مصرعوں سے کچھ بڑھا ہوا ہے ؂

''اے دیوی تم امر کنول کی امر مہک ہو، تم سے معطر عالم عالم''

اس طرح شعر کے مصرعے میں ایک رکن زیادہ ہے۔ اگر وہ اسے دو ٹکڑوں میں کر کے لکھتے تو اس عیب کا احساس نہ ہوتا۔ پہلا ٹکڑا ؂

اے دیوی تم امر کنول کی امر مہک ہو
تم سے معطر عالم عالم !

....

اس طرح ہیئت کی تبدیلی سے عیب حسن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد

شاعر نے اپنے ماضی کو مختلف صنعتوں سے مخاطب کیا ہے۔ کہیں اسے لافانی راگوں کی وینا بتایا ہے، کہیں حسن کا نغمہ اور عشق کا سُر گم۔ چونکہ ماضی ہمیشہ ماضی رہتا ہے جو لازوال ہے۔ اس لئے اس کے لئے انھوں نے اسے

''اَبد نشاں تخلیق کا چشمہ''

بتایا ہے۔ اس طرح مختلف صنعتوں سے تخاطب کے بعد انھوں نے ماضی کو دوسرے رخ سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ ماضی صرف حسین ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی تہہ میں طوفان خیزیاں بھی چھپی ہوئی ہوتی ہیں جس کی وسعت لامحدود اور بیکراں ہے۔ شاعر نے اپنے اس احساس کو اپنی فکر کے آئینہ میں دیکھ کر بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ دیکھئے

کتنے شعلے دل میں سوزاں کتنے شرر چھاتی میں پنہاں
اپنے حسین پیڑو میں بسائے جانے کتنے دہکتے سورج
جانے کتنے ماہ و انجم، جانے کتنی کاہکشائیں
کتنے سمندر، کتنے طوفاں ، کتنے مانجھی ، کتنے کنارے
کتنے ازل ہیں، کتنے ابد ہیں، کتنے گگن ہیں، کتنی دھرائیں
کتنے زماں ہیں، کتنے مکاں ہیں، کتنی فضائیں، کتنی خلائیں
تم سے یہ ہستی، تم سے یہ دھرتی جانے کب سے مہک رہی ہے
جانے کب سے رقص کناں ہے، جانے کب سے چہک رہی ہے[1]

....

---

[1] ماضی (مخطوطہ)، صفحہ ۲

اس کے بعد انہیں اپنے ماضی کی یاد اس لئے ستاتی ہے کہ اس میں ان کا محبوب بھی جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ یہاں انہوں نے ماضی کو ایک مبہم تخیل اور محبوب کو ایک بے دار حقیقت بتایا ہے اور اپنے اس مصرع کی توجیح پیش کردی ہے ؎

جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں
کیوں ماضی پر مرتا ہوں

شاعر نے نظم میں تنوع پیدا کرنے کے لئے مختلف بحریں استعمال کی ہیں۔ یہ بحریں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں بلکہ صرف زحافات کی تبدیلی سے بحروں میں تنوع پیدا کیا ہے۔ اس بند میں شاعر نے ماضی کو دام سلاسل اور ایک شکنجے سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا محبوب بھی دام سلاسل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد آخر میں اس بند کو پھر اپنے اسی ٹیپ کے مصرع پر ختم کیا ہے "جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں"۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ماضی کو تاریخ کے جھروکوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح سرکش انسانوں نے قوموں کو کچلا ہے۔ یہاں ایک مصرع میں شاعر نے عجز بیان کا ثبوت دیا ہے۔ اصل راگ کا نام بھیروی ہے، مگر شاعر نے اسے بھیری نظم کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"پھر بھی نہ جانے کون ہے جس کی بھیری کی مسحور صدائیں"

....

اس کے بعد بند کے پس منظر کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

پھر بھی نہ جانے کون ہے جس کی تیغوں کی قاتل جھنکاریں
پھر بھی نہ جانے کون ہے جس کے وحشی گھوڑوں کی ٹاپوں سے

میری دھرتی کانپ رہی ہے میری ہستی کانپ رہی ہے
اور میں حال سے باغی ہو کر
اس کی رکابیں چوم رہا ہوں

....

اگلے بند میں ماضی کی تہذیب وتمدن کی جھلکیوں کو دکھایا ہے کہ کس طرح ماضی کے ایوانوں میں تہذیب کی رچنا ہوئی ہے اور اس تہذیب کے آثاروں میں کیسے کیسے فنی شاہ کار وجود میں آئے جس کی تفصیل بتاتے ہوئے شاعر کہتا ہے :

مورتیاں ممیاں بت خانے — مقبرے قلعے مسجد مندر
عیش و عشرت کے میخانے — جام و صہبا ساقی و ساغر
علم و جہل کی سجدہ گاہیں — جبر و خوف کے سنگین مامن
میری عبودیت کے معبد — میرے خداؤں کے وہ مسکن
دیواریں اونچے مینارے — ایلورا، اہرام و اجنتا
فنکاروں کے لہو میں ڈوبے — معماروں کے خون سے نکھرے
کوڑوں کے زہریلے افعی — لپٹے تھے ان کے جسموں سے
پھر بھی یہ باعظمت معبد — ان مظلوموں نے ہی سجائے

....

اگلے بند میں دکھایا ہے کہ تہذیب اپنے معراج کو پہنچ کر کس طرح تخریب کاروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی اور اس نے انسانیت کا خون کس طرح کیا۔ یہ پس منظر یقیناً بڑا ہولناک اور دردناک ہے جس کا فراموش کر دینا بہتر تھا، مگر شاعر پھر ٹیپ کے مصرعوں سے

سوال کرتا ہے :

"جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں"

....

آگے چل کر شاعر کے احساس پر رومانیت چھا جاتی ہے اور وہ بتاتا ہے کہ تہذیب کے ہاتھوں دنیا پر ہزار تباہی آئی ہو لیکن پھر بھی اس کے دریچوں میں قوسِ شفق کے رنگ چھاتے ہیں اور یادوں کے شکارے میں نسیم تمنا رقص کرتی ہے۔ اگلے بندوں میں رومانیت کی لہر وجد کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور شاعر اپنے ماضی کو کسی طرح بھولنے پر تیار نہیں۔ کہتا ہے

میرے تصور کا بھادوں تھا، میری تمنا کا ساون تھا
میری امنگوں کا مرقد تھا، میری محبت کا مدفن تھا

....

اور اس بند کو اس شعر پر اختتام کو پہنچاتا ہے ۔

یہ تو ایک زندہ مرشد ہے جس کے اشاروں پر قرنوں سے
میں ہستی کے ویرانو ں میں دوڑ رہا ہوں، ناچ رہا ہوں

....

اور شاعر کی آرزو اسے اپنے ماضی کا تعاقب کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے بعد شاعر نے نظم کی بحر میں پھر قدرے کی تبدیلی کی ہے اور اگلے بند میں شاعر کا تخیل پھر تاریخ کے جھروکوں تک لے جا کر اسے گزرے ہوئے واقعات کی سیر کراتا ہے۔ اس بند میں شاعر نے نظم کے الفاظ میں اپنے دل کے درد کے کسک کی روح کو بھر دیا ہے ۔

مطرب کی قبا جس نے پہنی، ساقی کا جس نے روپ بھرا

اور اپنے خونی ہاتھوں سے سقراط کو جامِ زہر دیا
کی جس کے جگر کے ٹکڑوں نے عیسیٰ کے لہو سے نقاشی
وہ قاتلِ اہلِ بیت مگر اس کا ہی تو پالا پوسا تھا
اک ہات میں جس کے تھا خنجر، اک ہات میں جس کے وحیِ خدا
ہونٹوں پہ کلمۂ دین مبین اور قتل کا فتویٰ زیرِ عبا
سر تپتی خاک کے طشت میں رکھا جس نے حسینِ اعظم کا
اس مشہد کے دیوار و در مرہونِ خشت و سنگ نہ تھے
اس مقتل کی بنیادوں میں چونا ہی نہ تھا، گارا ہی نہ تھا
رخسارِ لالہ فام بھی تھے حلقومِ گل اندام بھی تھے
اشکوں سے چھلکتے نین بھی تھے اور خشک لبوں کے جام بھی تھے

جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں
کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

....

اگلے بند میں شاعر نے پھر بندوں کی بحروں میں تبدیلی کی ہے لیکن اس تنوع سے نظم کی یکسانیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ ہی اس میں کوئی اکتا دینے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں بھی شاعر نے تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے اگلے بند میں شاعر نے خورشید احمد فارق، پروفیسر شعبۂ عربی کے مقالے بہ عنوان ''دورِ علوی میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت'' سے استفادہ کر کے اس دور کے حالات کی عکاسی کی ہے جس کے باعث نظم کا یہ حصہ خیالی ہونے کے بجائے یکسر واقعاتی ہو گیا ہے۔ آگے چل کر شاعر دکھاتا ہے کہ

حالات کی تبدیلی نے کس طرح دنیا کو طبقوں میں تقسیم کیا اور آزادی کے بجائے دلوں کو سوزِ غلامی اور داغ نفرت سے بھر دیا۔ پھر دکھایا ہے کہ سماج کس طرح اونچ نیچ کے بندھنوں میں گرفتار ہو گیا اور ایک بہت بڑے طبقے کو اشدھ بنا دیا جو نہ اونچے طبقے کی زبان سیکھ سکتا تھا اور نہ مندر کے دروازے میں داخل ہو سکتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ دنیا میں سرمایہ داری نظام کس طرح قائم ہوا اور اس کے ہاتھوں کس طرح نسل کشی ہوئی اور پھر اس طبقہ کی محفلیں کس قدر رنگا رنگ مستیوں میں ڈوب گئیں۔ یہ مناظر یقیناً روح فرسا تھے مگر پھر بھی شاعر کا دل مجبور کرتا ہے کہ وہ تاریخ کے باقی حصوں کی جھلکیوں پر ایک نظر ڈالتا چلے۔ جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں مہارشیوں کی تپسیائیں امرت رس گھول رہی تھیں اور ترسی ہوئی روحوں کو شانتی کے پیغام سے مسحور کر رہی تھیں۔ اب شاعر دنیا کے وسیع پس منظر سے نکل کر گنگ و جمن کی وادی میں آتا ہے جہاں دھرم یکسر پیغامِ محبت ہے۔ اس پیغام کی روح کو سمیٹے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

انسان ہی اپنا خالق ہے انسان ہی اپنا رکھوالا
دھرم ہی کانٹوں سے بھی محبت دھرم ہے قاتل کی بھی سیوا

....

نظم کے آخری حصہ میں شاعر کا رومانوی انداز تبدیل ہو جاتا ہے اور اس پر ترقی پسندی کا پرتو منور ہو جاتا ہے جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ سماج کے ظالم طبقے نے غریبوں کو اپنے شکنجے میں کس دیا ہے اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ بھوک اور پیاس سے بے حال ہے جس کے رہنے کے لئے نہ تو کوئی مٹی کی کوٹھری ہے نہ چھپر کا سایہ جس کے نیچے وہ اپنی زندگی گزار سکے۔ اس کے رنگ محل اگر ہیں تو وہ فٹ پاتھ ہیں جن کی سخت زمین اس

کا مقدر ہے۔ اسے ذیل کے منظر میں ملاحظہ کیجئے

اور مرے تن کا چوتھا ٹکڑا آج بھی ظلموں کا ہے نشانہ
طوق و سلاسل پگھل گئے ہیں لیکن وہ آزاد نہیں ہے
آج بھی بھوک اس کو ڈستی ہے آج بھی پیاس اس کو کھاتی ہے
نگر نگر فٹ پاتھ کے پتھر آج بھی اس کے رنگ محل ہیں
کیا کوئی ان بھوکے پیاسوں کا اس جنگل میں راہ نما ہے
کیا کوئی دیوتا ہے دھرتی پر، کیا کوئی انسانوں کا خدا ہے

....

آگے چل کر شاعر بڑے دکھ کے ساتھ اظہار کرتا ہے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر آج بھی تاریکی کا راج ہے، چاروں طرف اندھیرے کا راج ہے، لیکن اس کے باوجود شاعر تعجب سے سوچتا ہے کہ وہ ماضی کا دیوانہ کیوں ہے۔ آگے چل کر شاعر نے بحر میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے اور فلسفیانہ وجدان اس پر آشکار کرتا ہے کہ ہر عہد کا ماضی ہو جانا زخارِ ابد میں گھل جانا اور جبارِ ادب میں کھو جانا لازمی ہے۔ ہر نیکی ایک رخشِ شر ہے اور بدی ایک چنگاری۔ ماضی کا بِرا ایک بحرِ بے پایاں ہے۔ اس کے ساحل تک کوئی پہونچے تو کیونکر پہونچے۔ یہاں شاعر کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ بے اختیار چیخ اٹھتا ہے

بیتے ہوئے لمحوں کو پکڑنا لفظوں سے آسان نہیں ہے
یہ ہے وہ منزل جس منزل پر قلم کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں
کیا ہو بیاں افسانہ ماضی خوں میں ڈوبا ہوا کرتا ہے
دار و رسن کی ایک کہانی طوقِ سلاسل کا قصا ہے

اور پھر شاعر عہد حاضر پر تبصرہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ سماج کی بے راہ روی کو چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ خاں، سکھ دیو، دت اور اودھم سنگھ نے شہید ہو کر اپنے خون کے چھینٹوں سے کس طرح نقاشی کر کے اسے بنایا اور سنوارا اور جب ناگا ساکی اور ہیروشما پر افلاک سے دوزخ برس رہے تھے مہاتما گاندھی، مارٹن لوتھر اور دوسرے ویت نامی جیالوں نے کس طرح اپنے خون سے گل کاری کی۔ یہاں وہ پوچھتا ہے کہ وہ برابری کے جذبے، رزاقی کے دعوے اور خلد آزادی کے خاکے کہاں ہیں؟ کیا مسلسل تاریکی کا نام ہی اجالا ہے؟ اور آخر میں وہ بڑی دل سوزی سے پوچھتا ہے

حق ہے اگر تو کیوں نہیں ڈھلتا نئی حقیقت کے سانچے میں
نئی حقیقت کیوں نہیں بھرتی رنگ بھرے دھندلے خاکے میں

....

پھر دکھاتا ہے کہ اس کی اپنی صدی جس میں وہ سانس لے رہا ہے کیسی ہے

اپنی صدی ماضی کی طرح تاریخ کی سب سے خونی صدی ہے
وقت کا سب سے قاتل دور ہے لمحہ لمحہ اس کا درندہ!
نفس نفس اس کا ایٹم ہے اس کا سایہ موت کا سایہ
ماضی خون میں لتھڑا ہوا تھا حال بھی خون میں ڈوبا ہوا ہے

حال بھی ماضی فردا ماضی
جو کچھ ہے فانی ہی فانی
جو کچھ ہے ماضی ہی ماضی

....

اور نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے

اس ظالم قاتل دنیا میں آس کا تم ہو ننھا پرچم
اے دیوی تم امر کنول کی امر مہک ہو تم سے معطر عالم عالم

....

حاصل گفتگو یہ ہے کہ اس نظم میں شاعر نے پوری انسانی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کس کس طرح سماج میں تبدیلیاں آئیں، مظلوم انسانوں پر کس طرح ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، کس طرح قوموں کو غلام بنایا گیا۔ یہاں پہونچ کر چاہئے تو یہ تھا کہ شاعر کسی رجائی پہلو پر روشنی ڈال کر نظم کو ختم کرتا لیکن اس کے دکھی دل نے اسے قنوطیت کے شکنجے سے نکلنے نہیں دیا۔

نظم کافی طویل ہے اس لئے شاعر نے بحروں کے تنوع سے اسے دل نشیں بنانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بحروں کی اس تبدیلی نے نظم میں یکسانیت پیدا نہیں ہونے دی۔ اس طرح نظم میں کسی قسم کی بے رنگی اور اکتا دینے والی کیفیت نہیں پیدا ہوسکی۔ افسوس ہے کہ یہ خوبصورت نظم اشاعت سے محروم رہ گئی جو یقیناً فنی حیثیت سے ساغر نظامی کا شاہکار ہے۔

ماضی

جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں؟

کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟ !

اے دیوی! تم اُمر کنول کی اَمر مہک ہو تم سے مُعطّر عالم عالم

لافانی راگوں کی وینا حسن کا نغمہ عشق کا سرگم

اَبد نشاں تخلیق کا چشمہ ممتا اور امید کا سنگم

نظر نظر اک پیار کا جھرنا نفس نفس گہوارۂ آدم

رقص کناں پھولوں کا گلشن نغمہ کناں سایوں کا آنگن

موجِ بہاراں پیار کا موسم شوق کا بھادوں درد کا ساون

اپنے حسین پنڈے میں چھپائے جانے کتنے لالۂ خنداں

کتنے باتیں کرتے غنچے کتنی نہ جانے گُپ چُپ کلیاں

کتنی خندہ بار کھیتیاں کیسر کے نیلے پھولوں کی!

کتنے مستی میں لغزیدہ چمپا کے مہکے باغیچے

کتنی خوشبو ریز کیاریاں موتیا جوہی اور بیلے کی
کتنی نغمے کناں خوشبوئیں اور کتنی رقاص صبائیں
جانے کتنے لافانی نغموں کے جاری و ساری چشمے
جانے کتنے اَمر زمزمے ساز محبت کے تاروں کے
نینوں کے تالاب میں جانے کتنے کنول اشکوں کے خنداں
کتنے شعلے دل میں سوزاں کتنے شرر چھاتی میں پنہاں
اپنے حسیں پیڑو میں بسائے جانے کتنے دہکتے سورج
جانے کتنے ماہ و انجم، جانے کتنی کاہکشائیں
کتنے سمندر کتنے طوفاں کتنے مانجھی کتنے کنارے
کتنے ازل میں کتنے اَبد میں کتنے گگن میں کتنی دھرائیں
کتنے زماں ہیں کتنے مکاں ہیں کتنی فضائیں کتنی خلائیں
تم سے یہ ہستی تم سے یہ دھرتی جانے کب سے مہک رہی ہے
جانے کب سے رقص کناں ہے جانے کب سے چہک رہی ہے
گیتی گیتی گگن گگن تم کرن کرن تم شبنم شبنم
اہرمن ویزداں پر طاری حوا حوا آدم آدم
نور تمہارا قرنوں قرنوں جوت تمہاری عالم عالم

ماضی مبہم ایک تخیل اور تم اک بیدار حقیقت
ماضی رہِ کا غبار گذراں تم ہو پھلوں کی تازہ ٹہنی
ماضی مردہ اور تم زندہ، ماضی فانی اور تم لافانی

تم ہو خالق تم ہو حامل، انجانی تخلیق کے خالق

ماضی اک ڈوبا ہوا سورج تم ہو ابھرتا ماہِ کامل

جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں ؟

کیوں؟ ماضی پر مرتا ہوں ؟

(قدرے بحر کی تبدیلی کے ساتھ)

ماضی تو دامِ سلاسل تھا ماضی تو ایک شکنجہ تھا

برباد شدہ زندانوں کا اک سلسلۂ زنجیر گراں

اک جبر کدہ، جس جبر کدے نے زنجیریں ہی زنجیریں دیں

حرفوں، لفظوں کی زنجیریں، پھولوں کلیوں کی زنجیریں

سونے چاندی کی زنجیریں، لوہے پیتل کی زنجیریں

بھرے خوابوں کی زنجیریں، وحشی جذبوں کی زنجیریں

جھوٹے سچ کی کچھ زنجیریں، سچے جھوٹ کی کچھ زنجیریں

قرنوں کی بوجھل زنجیریں، صدیوں کی نازک زنجیریں

ان زنجیروں میں کسی ہوئی تھیں، سرتاپا تم جکڑی ہوئی تھیں

خالق تھیں تم اور اپنی مخلوق ہی کی زندانی تھیں

ماضی کے قدموں کی کچلی ماضی کے خنجر کی زخمی !

ماضی تو دامِ سلاسل تھا ماضی تو ایک شکنجہ تھا
برباد شدہ زندانوں کا اک سلسلۂ زنجیر گراں

جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں
کیوں ماضی پر مرتا ہوں! ؟

آج بھی اسکے طوقِ خیالی اسکی اَن دیکھی زنجیریں
اسکی زیاں کاری کے حلقے اسکے حاصل کی زنجیریں
زنگ آلودہ حق کے شکنجے مبہم باطل کی زنجیریں
جکڑے ہوئے ہیں میرے تخیل میرے تصور میری حس کو
میرے مذاق وہم ویقین کو علم وخبر کو جکڑے ہوئے ہیں
خاکستر ہیں پھر بھی میرے جسم وجاں کو جکڑے ہوئے ہیں
میرے زماں کو، میرے مکاں کو، میرے جہاں کو جکڑے ہوئے ہیں
آج بھی اسکے طلائی خنجر کند اور زنگ آلودہ خنجر
قلب وجگر میں اترے ہوئے ہیں فکر ونظر میں اترے ہوئے
میرے دل کی شریانوں سے خونِ تمنا چوس رہے ہیں
آج بھی اسکی سرکش لیکن مردہ آگ کے ٹھنڈے شعلے
لالہ وگل کو پھونک رہے ہیں برگ و ثمر کو پھونک رہے ہیں
شام وسحر کو پھونک رہے ہیں میرے گھر کو پھونک رہے ہیں
اور میری مبہوت بصیرت گھر کو جلتے دیکھ رہی ہے

سارا لاؤ لشکر اسکا بحرِ عدم میں ڈوب چکا ہے
پھر بھی نہ جانے کون ہے جسکی بھیری کی مسحور صدائیں
پھر بھی نہ جانے کون ہے جسکی تیغوں کی قاتل جھنکاریں
پھر بھی نہ جانے کون ہے جسکے وحشی گھوڑے کی ٹاپوں سے
میری دھرتی کانپ رہی ہے میری ہستی کانپ رہی ہے
اور میں حال سے باغی ہو کر
اسکی رکابیں چوم رہا ہوں
سنتے ہیں تہذیب کی رچنا اسکے ایوانوں میں رچی ہے
لاکھوں رنگ اور قسم کی صہبا اسکے پیمانوں میں ڈھلی ہے
دُختِ وحشت روحِ جبلت اسکے گہوارے میں پلی ہے
مورتیاں، ممیاں، بت خانے، مقبرے، قلعے، مسجد، مندر
عیش و عشرت کے میخانے جام و صہبا ساقی و ساغر
علم و جہل کی سجدہ گاہیں، جبر و خوف کے سنگیں مامن
میری عبودیت کے معبد، میرے خداؤں کے وہ مسکن
دیواریں، اونچے مینار یں، ایلورا، اہرام واجنتا
فنکاروں کے لہو میں ڈوبے معماروں کے خون سے نکھرے
کوڑوں کے زہریلے افعی لپٹے تھے انکے جسموں سے
پھر بھی یہ باعظمت معبد، ان مظلوموں نے ہی سجائے
جہل کے سنگِ سیہ میں لپٹا عقل و خرد کا کھوٹا سونا

نور کا ورثہ، علم کا تحفہ، جد و جہد کا تپتا صحرا

حسن رقصاں عشق وحشی ذوق و ہوس کا تند سمندر

لوح و قلم الہام والقا تخت و تاج اور تیغ و خنجر

جہل و خبر افکار و تجسس ایمان و افکار کا جوہر

صدیوں کی لوٹی ہوئی حکمت قرنوں کی پالی ہوئی عظمت

سینکڑوں خاکے سینکڑوں نقشے سینکڑوں خوابوں کا اک جنگل

اپنے سپوتوں کو ایک ہات سے ساری دولت و حکمت دے کر

دوسرے ہات سے آنکھ بچا کر میری ہری بھری جنت میں

میری ہری بھری جنت میں چھوڑ دیا خونخوار درندہ!

اسکو ورثہ میں جو ملا تھا اسکی رگ رگ میں جو حل تھا

پھرتا ہے جو گلیوں گلیوں خون بہاتا آگ لگاتا

آگ کے صحرا میں اٹھلاتا، خون کے دریا میں اتراتا

جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں

کیوں ماضی پر مرتا ہوں ؟

ماضی گو اک قبر کدہ ہے جبر کدہ ہے لیکن پھر بھی قصرِ صبا ہے

اسکے جھروکے میں چلتے ہیں نشے کے لغزیدہ جھونکے

اسکے دریچوں میں آتے ہیں قوس و شفق مستی میں ڈوبے

رقص میں ہے تسنیم تمنا وجد میں ہیں یادوں کے شکارے

آہ یہ شہر لالہ رخاں تھا میرا دیار سیم تناں تھا
محفل نغمہ بزم طرب تھا، محشر صد آتش نفساں تھا
اسکی روپہلی اسکے سنہری اسکے نشیلے رنگ محل میں
لہراتے رنگیں آنچل تھے مہکے ہوئے سیمیں داماں تھے
جتنے راز تھے عشق وہوس کے میرے جنوں پر سب عریاں تھے
حسنِ تشنہ کا پیمانہ، پیاسے عشق کا مے خانہ تھا
آرزوؤں کا رقص کدہ تھا ارمانوں کا پری خانہ تھا
ہر سو صہبا ریز تنفس، ہر نغمہ سیلابِ ترنم
گلے گلے نشے کا طوفاں اور مانجھی ساقی کا تبسم
شوق بھری معصوم آنکھوں میں سولرزیدہ حسرتِ عصیاں
پارہ پارہ زہد خیالی ٹکڑے ٹکڑے دامنِ ایماں
بل کھاتی نازک کمریں تھیں، لچکیلے ابھرے کولہے تھے
ہوش پہ دام گُشا آنکھیں تھیں موت پہ طنز گناں سینے تھے
برف میں ڈوبی شامِ گرما تپتی ہوئی سرما کی راتیں
نغموں کے ہالوں میں نالے تال کے روپ میں ٹھنڈی آہیں
رقصِ جنوں انگیز کا محشر سینہ بہ سینہ ایک قیامت
لاؤ مری تقدیس عصیاں، لاؤ مری تحریمِ محبت
مری جوانی کا میخانہ اسنے ہی برباد کیا ہے
میرے گندمی رنگ کا سونا اس اس قزاق ہی نے لوٹا ہے

اور مرے کوہِ نور کو اس نادر ہی نے اِسمگل کیا ہے

میرا ایکڑیل سینہ اسکی ضربوں ہی کی نذر رہوا ہے

جو بھی وقت عدم میں ڈوبا سب کا سب دیوانہ پن تھا

اور یہ دیوانہ پن کیا تھا ہستی کا پورا جوبن تھا

ہر ذرّہ حکمت کی نظر تھا ہر پتھر حق کا درپن تھا

میرے تصور کا بھادوں تھا، میری تمنا کا ساون تھا

میری امنگوں کا مرقد تھا میری محبت کا مدفن تھا

میرے نیک و بد کا مدفن، میرے گناہ و ثواب کا مدفن

میرے ادھورے خوابوں کا ویران شکستہ تنہا مدفن

سینکڑوں ہات درِ دل پر ہیں اور دستک کی لاکھ صدائیں

کھل گئے پھر حسرت کے دریچے رقص میں ہے پھر عشرت عصیاں

کیا یہ جنوں ہے یا ماتم ہے یا ہے فقط اک جشن تصور

ہائے غبار خواب ہے باقی اب نہ حقیقت کی خاکستر

پھر بھی اسکے طوقِ خیال اسکی خاک شدہ زنجیریں

پازیبوں کے نسخے بن کر میرے لہو میں گونج رہی ہیں

مقبرہ ویراں ہی نہیں یہ میری جوانی اور طفلی کا

یہ تو اک زندہ مرشد ہے جسکے اشاروں پر قرنوں سے

میں ہستی کے ویرانوں میں دوڑ رہا ہوں ناچ رہا ہوں

خاک بسر اور ننگے پاؤں خونیں جھاگ لئے ہونٹوں پر

ہر لمحہ جوڑ دیتا ہے امروز کے بحرِ بے پایاں میں

اُسکا تعاقب کرتا ہوں

جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں

کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

(قدرے تبدیلی بحر کے ساتھ)

ان دیکھی دنیائے وجود اک لامتناہی جہانِ عدم

جسکی گود میں میری وحشت خنجر چمکاتی ہوئی جاگی

سنگین شکنجوں کی دنیا خوں ریز صلیبوں کا صحرا

ننگی وحشت کا اک جنگل جہلِ عریاں کا گہوارا

احساس جہاں ٹکڑے ٹکڑے دامانِ خرد پارہ پارہ

تہذیب کے شبنم آلودہ پودوں کا سلگتا وہ خرمن

وہ میکدۂ فکر والقا آتش کدۂ علم و عرفاں

وہ رقص گہہِ جہل و وحشت وہ قتل گہہِ فکرِ انساں

مطرب کی قبا جس نے پہنی ساقی کا جس نے روپ بھرا

اور اپنے خونیں ہاتھوں سے سقراط کو جامِ زہر دیا

کی جسکے جگر کے ٹکڑوں نے عیسیٰ کے لہو سے نقاشی

وہ قاتل اہل بیت مگر اِسکا ہی تو پالا پوسا تھا

اک ہات میں جسکے تھا خنجر اک ہات میں جسکے وحیِ خدا

ہونٹوں پہ کلمۂ دینِ مبین اور قتل کا فتویٰ زیرِ عبا

سر تپتی خاک کے طشت میں رکھا جس نے حسین اعظم کا

اس مشہد کے دیوار و در مرہونِ خشت و سنگ نہ تھے

اس مقتل کی بنیادوں میں چونا ہی نہ تھا گارا ہی نہ تھا

رخسارِ لالہ فام بھی تھے حلقومِ گل اندام بھی تھے

اشکوں سے چھلکتے نین بھی تھے اور خشک لبوں کے جام بھی تھے

جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں

کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

(قدرے تبدیلی بحر کے بعد)

شگفتگی سے گل ڈرتے تھے پودے اگنے سے چھپتے تھے

کونپلیں جھانک نہیں سکتی تھیں مٹی کے خاکی پردوں سے

جو بھی نخل اُگا کمھلایا جو بھی پھول کِھلا مرجھایا

قدم قدم شعلے اگتے تھے نفَس نفَس مدہوش تھی جوالا

جنکے بدن پتھر جیسے تھے سانس نہیں لے سکتے تھے وہ بھی

ہستی سے منہ موڑ کے سارے رہتے تھے تپ جپ کی شَرن میں

لپٹے تھے وہموں کی چتا سے سڑتے تھے حکمت کے کفن میں

دھوپ اور چاندنی کے آنگن میں ظالم رقصاں قاتل خنداں

دستِ ساقی خنجر عریاں، خونِ غریباں بادۂ ارزاں

من کا بکنا تن کا بکنا، پھر بھی گدائی پھر بھی فاقا

تاج شہی تھا ایک کے سر پر سبکے ہاتھوں میں کاسہ تھا

گویا ماضی ویرانے میں بھکاریوں کا اک تکیہ تھا

اور یہ تکیہ بازیچہ تھا جلادوں کا قزاقوں کا

چھایا ہوا تھا زماں و مکاں پر ہر سو گردِ سرخ کا طوفاں

اس طوفاں میں لعبتِ دوشیں کی عظمت کا ''روشن'' چہرا

گردِ سرخ میں اَٹ کر اپنے دل کش نقش بھی کھو بیٹھا تھا

موت کی جڑ اتنی گہری ہے اِسکے بحرِ بے پایاں میں

تازہ دم غواص بھی غوطے کھاتے ہیں اور کھو جاتے ہیں

موت کی جڑ کو چھو نہیں سکتے من کا موتی پا نہیں سکتے

قطرہ بن کر بحرِ ابد میں، بحر کی عشرت بن جاتے ہیں

اور عشرت مستغنی عشرت سطحِ رواں پر سو جاتی ہے

چند پرندے اوجِ فضا میں اڑتے ہیں اور کھو جاتے ہیں

اور بحرِ ذخار کی موجیں راگ ابدیت کے گاتی ہیں

موت اور زیست سے غافل ہو کر بے پروا گاتی رہتی ہیں

دین کے آہنی طوق و سلاسل جو خود میں نے ہی ڈھالے تھے

جن سے اپنے روح و دل کو عقل و خرد کو خود جکڑا تھا

دست جبلت نے انکو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ہی ڈالا

گویا مکڑی کا جالا تھا روح و دین کا آہنی بندھن

ہر نیکی اک رقصِ شرر ہے اور بدی اڑتی چنگاری

روشنی اک برقِ مستعجل اور اندھیرا شمعِ قائم

علم و وجدان کیفِ گذران، فطرتِ انساں ثابت و دائم

اور ماضی صحرائے مطلق اور ماضی بحرِ بے پایاں

یکسر عظمت یکسر وسعت تعمیر و تخریب و وحشت

بیتے ہوئے لمحوں کی اسیری لفظوں میں آسان نہیں ہے

ہے یہ وہ منزل جس منزل پر قلم کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں

ہستی کا آغاز بھی طفلی

ہستی کا انجام بھی طفلی

کیا ہو بیان افسانہ ماضی خون میں ڈوبا ایک کرتا ہے

دار و رسن کی ایک کہانی، طوق و سلاسل کا قصہ ہے

اسکے بازاروں میں جسمِ انساں ایسے ہی بکتے تھے!

جیسے غلہ، جیسے کھجوریں، جیسے خچر، جیسے بھیڑیں

جیسے بکریاں، جیسے اونٹ اور جیسے گھوڑے، جیسے ہاتھی

جیسے پتھر، جیسے لکڑی، جیسے کپڑے، جیسے دریاں

آن کی آن میں بن جاتی تھی شہزادی بھی ادنیٰ لونڈی

کیوپڈ تھا بچوں کا کھلونا، سائکی جنس بازاری تھی
اور کوئی شہباز جھپٹ کر لے جاتا تھا اسکو ایسے
جیسے وہ مظلوم حسینہ اسکے مقدر کا کھاجا ہے
جیسے وہ شہزادی نہیں ہے اونٹنی کا تازہ بچہ ہے
جیسے ہرنی، جیسے گھوڑی، جیسے تیر چھدی اک چڑیا
جیسے جہادِ حق کا پھل ہے، جیسے اک قدرت کا عطیا!؟
شب کی ظلمت چھٹنے پر بھی ہو نہ سکا زنداں میں سویرا [1]
پرتوِ خور سے اور بڑھی کچھ گرمیِ بازارِ غلامان
صدیوں کی زنجیر سے پھوٹے نت نئے حلقے نت نئی کڑیاں
کڑیوں کے شعلوں سے پرے زہر میں لپٹے باغ و بیاباں
باغ و بیاباں نخل و خیاباں ہرے بھرے کھیتوں کے میداں
انکے مالک عادل عالم عابد صوفی عارف خواجہ
نان کے ایک ٹکڑے کے عوض دینار و درم لیتے تھے اُنسے
اور غلام یہ سودِ مسلسل نسلوں نسلوں دیتے رہتے
آقا کی میراث میں انکا حصہ کیسا، صرف صفر تھا
کوئی نہ سامان کوئی نہ ارمان کوئی نہ در تھا کوئی نہ گھر تھا
کوئی قیدی سونا چاندی دے کے اگر آزاد بھی ہوتا

---

[1] شہدائے آزادی، چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ خاں، سکھ دیو، دت، اودھم سنگھ اور بھگت سنگھ

پھر بھی حلقے زنجیروں کے اسکی روح کو ڈستے رہتے
اسکی خاک کو ڈستے رہتے اسکی آل کو کھاتے رہتے
اور جو کوئی ورثہ تھا بھی تو یہ فقط اسکا ورثہ تھا
محکم عہد وفا آقا سے پیہم اک بیگار کا وعدا
صدیوں صدیوں سوزِ غلامی نسلوں نسلوں عہدِ غلامی
اور اس عہد کے سرنامے پر دین کی مثبت مہر لگی تھی
صبح ہوتے بس اتنی ہی عقل و خرد کی آنکھ کھلی تھی
جس ماضی میں یہ سب کچھ تھا اُس سے محبت کرتا ہوں
جانے میں ماضی کی تمنا کیوں کرتا ہوں!؟
کیوں ماضی پر مرتا ہوں!؟

اِسکے سمندر کے سینے پر ایسے جہازی بھی بہتے رہتے
جنکے دین پرست شکاری نوخیزوں کا شکار بھی کرتے
خواہ کسی کے نورِ نظر ہوں خواہ کسی کے دل کے ٹکڑے
خواہ کہیں کے شہزادے ہوں خواہ کہیں کے تاجر زادے
دین پرست کمانداروں کو ان پر کوئی رحم نہ آتا
بھیڑوں کے گلّے کیطرح انسان ہی انسان کو لے جاتے
اور غلاموں کی منڈی میں صرف وہی نوخیز نہ بکتے
انکی ہیئت بھی بک جاتی، انکی قسمت بھی بک جاتی

انکی جوانی بھی بک جاتی انکا بوڑھاپا بھی بک جاتا

انکے قبیلے انکے کنبے انکی نسلیں بھی بک جاتیں

اور زمین بھی دیکھتی رہتی اور فلک بھی تکتا رہتا

جیسے فلک ظالم شاہیں تھا معصوموں کے خون کا پیاسا

جیسے زمیں گرگِ دیوانہ، اپنے شکار کی دھُن میں اندھا

گر کوئی محمود اسیر زلف ایازاں ہو بھی جاتا

علم وحسن کا جادو اسکے دل پہ جوش ہوس میں چل بھی جاتا

زہر عشق رگوں میں اُسکی خوں کی طرح گردوڑ بھی جاتا

ہوش وحواس کو گم کر دیتا عقل وخرد کو گنوا بھی دیتا

تج کر دین ودنیا پیہم پائے جمال پہ سجدے کرتا

دولت دیتا سطوت دیتا تخت بھی دیتا تاج بھی دیتا

لیکن اس محبوب وساحر شاہِ وقت غلام کے ہاتھوں

ایک بڑے بازار کا بابِ آہنی کھلتا خوں برساتا

وہ ملکوں کو غارت کرتا وہ قوموں کو غلام بناتا

اپنی غلامی کے بدلے میں انکے سر کے جام بناتا

گرمیِ بازار غلاماں پھر بھی جہاں میں کم نہیں ہوتی

نغماتِ آوازِ سلاسل کون ومکاں میں کم نہیں ہوتی

لاکھوں طوق کے زیور ہوتے انسان کی زخمی گردن میں

شعلے اور بھی رقصاں ہوتے نسلِ آدم کے خرمن میں

یہ کوئی افسانہ نہیں ہے وقت کے ایوانِ اعلیٰ میں
اس حق کی دیتے ہیں گواہی اُڑ اُڑ کر ماضی کے داماں!
کھنڈروں کے پیڑوں سے ابتک جھانک رہے ہیں مقتل و زنداں
پھر بھی انکی طرف بڑھتا ہوں
جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں؟

میری دھرتی کی چھاتی تو چھلنی چھلنی ہے صدیوں سے
میرا تن تو اک ساحر نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا
اور اِن ٹکڑوں کو ساحر نے چار حصوں میں بانٹ دیا تھا
اک ٹکڑے کے مکٹ پر اس نے تاج دھرا سونے چاندی کا
اور مستک پر منتر پڑھ کر لمبا سا اک تلک لگایا
پھر ریشم کے نیام سے اُس نے چَم چَم کرتی تیغ نکالی
وِش میں بجھائی خون میں ڈبوئی اور اُسکے ہاتھوں میں تھما دی
اور کہا۔ لے اسکے بَل پر راج کا سارا کاج چلانا
آج سے یہ دھرتی تیری ہے تو ہے اِس دھرتی کا راجا
بھول نہ جانا تو چیلا ہے میرا حکم چلانے والا
میں ہوں دھرا کے سینے پر یہ ساری جوت جگانے والا

....

دوسرے ٹکڑے کو ساحر نے باٹ ترازو آٹا بخشا

ہلدی مرچیں تیل اور دھنیا گھی کی ہنڈیا دل پتھر کا

تیرا ہرگز فرض نہیں ہے تیر و کمان تلوار اٹھانا

تو ہے دھرتی کا رکھوالا، تو اَن داتا تو دَھن داتا

سب جگ تیرے ہاتھ میں، ہوگا کیا سینا کیا راجا پرجا

....

تیسرے ٹکڑے کے ہاتھوں میں ساحر نے اک جھاڑو دیدی

اور اسکو انعام میں بخشا سوزِ غلامی، داغِ نفرت

دل میں اک طومارِ ملامت سر پر اک کہسارِ غلاظت

صدیوں صدیوں جھاڑو دینا، قرنوں قرنوں جھوٹن کھانا

اور مُردہ ڈھوروں کو مسلسل انجانے فردا تک ڈھونا

لرزاں لرزاں ترساں ترساں ہر دامن کش پرچھائیں سے

خود بھی بچنا اور کترا کر اپنے سایے کو بھی بچانا

اَن بھومی میں پاؤں نہ رکھنا، مہرشیوں کے وَن میں نہ جانا

جرم کنوئیں کے مَن پر چڑھنا، پاپ یگوں کی پیاس بجھانا

مندر کے در بند ہیں تجھ پر بھول کے گنگا جل نہ اٹھانا

ہاں اپنے بچوں کو لے کر قربانی کو حاضر رہنا

اور پھر مقتولوں کا ماتم اپنی بولی ہی میں کرنا!

بھولے سے بھی میری بھاشا اپنی زباں سے اشدھ نہ کرنا

....

تینوں نے شردھا سے جھک کر پیشانی چرنوں پہ جھکا دی
تیغ و ترازو کے نغموں سے گونج اٹھے صحرا و وادی
اور پھر ساحر تاج پہ چڑھ کر پوری شکتی سے چلایا
''میں نے آتما میں نے من کو میں نے دَھن کو جیت لیا ہے!
میں نے دھرا کو جیت لیا ہے میں نے گگن کو جیت لیا ہے
میں نے مکاں کو جیت لیا ہے میں نے زماں کو جیت لیا ہے
میں نے یقین کو جیت لیا ہے میں نے زماں کو جیت لیا ہے
حکمت کیسی سلطنتِ احساس کو میں نے جیت لیا ہے
اور اَمر زنجیر میں مینے جکڑ دیا ہے سارے جگ کو''
یوں اس ساحر نے اے ہمدم میرے جسم کی ساری شکتی
اپنی سرداری کی خاطر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی تھی
تن کا صرف اک ٹکڑا ہو کر خود یہ سب کچھ بن بیٹھا تھا!
میرے لہو سے اس درشٹی نے دھرم کا تانا بانا بنا تھا
اور یہ ایسی نسل کشی تھی اور ایسا خونِ ناحق تھا
جس پہ دیوتاؤں کے تن کا خونِ گرم بھی سوکھ گیا تھا
اُس کی نادر نسل کشی پر خالق بھی ہکّا بکّا تھا!
سارا کنبہ مار دیا اور خون کا اک قطرہ بھی نہ ٹپکا
اور جتنے بھگواں تھے بیٹھے مندر مندر رااونگھ رہے تھے!
کوئے مقتل کے کیوں آخر روز و شب دم بھرتا ہوں

جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں؟

کیوں ماضی پر مرتا ہوں!

صدیاں میری نسل کشی پر بیت گئیں اس صبر وسکوں سے
جیسے میرا قتل نہیں تھا ناٹکاؤں کا اک ناٹک تھا
آخر ایسا دور بھی آیا جب سینے سے زمان ومکان کے
اُسکی غلط بخشی کا طوفاں پوری مو اجی سے پھوٹا
وقت ہر اک شے سے مستغنی دھرتی کے اسٹیج پہ آیا
اور اپنے سنگیں ہاتھوں سے پتھر جیسا پردہ اٹھایا
دیکھا تو مے خانہ کھلا ہے رنگ محل اک رقص کدا ہے
قدم قدم پر نرتکیاں ہیں دور میں مَدِرا کا پیالہ ہے
دھرتی اور گگن ہیں رقصاں صبح ہے رقصاں شام ہے رقصاں
مدہ کے ہوش رُبا پیالوں میں پریاں اور گلفام ہیں رقصاں
ساقی رقصاں جام ہیں رقصاں مَدِراں رقصاں مینا رقصاں
راجہ رقصاں پرجا رقصاں، سارا راج کا راج ہے رقصاں
دھرم ہے رقصاں کرم ہے رقصاں تخت ہے رقصاں تاج ہے رقصاں
نشے میں ڈوبا ماضی رقصاں کل ہے رقصاں آج ہے رقصاں
راجہ کا دربار نہیں ہے عیش وہوس کی اک محفل ہے
اور محفل کے اک کونے میں مڑی ہوئی تلوار پڑی ہے

جس پہ نہ چھٹنے والے کالے رنگ کی گہری پرت چڑھی ہے

اور ساحرؔ تلوار کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ رہا ہے!؟

میرے تن کا تیسرا ٹکرا بھوکا، پیاسا، خون میں لتھڑا

اپنی جھونپڑی کے اک کونے میں بت کی طرح بیٹھا ہے

اس کے ناحق خون کے طوفاں مندر مندر اینڈ رہے ہیں

صدیاں لہو کے سیلابوں سے ایسے گزریں بے حس و غافل

جیسے کیسے نے چھین لیا ہو نوعِ بشر سے

جیسے رگوں میں خون نہیں ہے، جیسے خون میں آگ نہیں ہے

جیسے مشیّت کے دست و پا کر دیے ہوں مفلوج کسی نے

ایسے زنداں پر مرتا ہوں

جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں؟

کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

اور پھر اک دن وہ بھی آیا گردشِ دوراں نے جب ہنس کر

ہستی کے ناٹک کے رُخ سے دوسرا سنگیں پردہ اٹھایا

پردہ اٹھتے ہی اک نادر اور نیا منظر سامنے آیا

گوشے گوشے میں تپووَن کے مہرشیوں کی بھیڑ لگی تھی

چپے چپے پر تپسی تھے گپھا گپھا میں ایک سمادھی!

گیان کا اک چشمہ جاری تھا دھیان کی اک گنگا بہتی تھی

نگر نگر ویرانہ بنا تھا، جنگل جنگل آبادی تھی

مایا جال تھی ہستی یکسر نفس پہ تیاگ کی مہر لگی تھی

دھرتی ساری اک تقدیس بے پایاں سے دمک رہی تھی

اور ساحر بھی آنکھیں موندے ایک سمادھی میں بیٹھا تھا!

لیکن زہد شکن جب کوئی اپنا ساز بجاتی آئی

آنکھوں کو مٹکاتی آئی اپنی کمر لچکاتی آئی

اپنے سُرین گھماتی آئی چھاتی کو لرزاتی آئی

تپ جپ کو پگھلاتی آئی خون میں آگ لگاتی آئی

دھرتی اور آکاش کو اپنے قدموں سے دہلاتی آئی

جاگ اٹھی رگ رگ میں جبلت ہوگئی وا آغوشِ تمنا

بیٹھ گئے تپ جپ کے قلعے تیاگ کا دامِ جادو ٹوٹا!

اور دیکھا تو سارا تپووَن مستی کے قدموں میں پڑا تھا

سرخ آنکھوں سے چوم رہا تھا ساحر کام دیو کے تیروں کو

پنج رسوں کی مَدِ راپی کر ناچ رہا تھا جھوم رہا تھا

ہری بھری شاخوں سے نکلے زرد و سرخ پھلوں کے مکھڑے

بیلیں، پیڑ، ندی ہر نوتے چڑیاں گائیں مور اور جھرنے

حیراں حیراں، ترساں ترساں لرزاں لرزاں گُپ چُپ گُپ چُپ

تکنے لگے آپس میں چہرے ایک نشانِ سوال بنائے؟

ٹھہر گئی بہتی گنگا بھی دیکھ کے یہ طوفانِ عبرت

جیسے مقدس اس تپووَن میں بات کوئی ان ہونی ہوئی ہے

کام دیو نے ساز اٹھایا ٹھٹھہ مارا اور یوں بولا

"دیکھو میرے ایک ہی تیر سے تپ کا سنگھاسن ڈول گیا ہے

دیکھو سب کے من میں سکون ہے جیسے بند کسی دریا کا

طوفان کی چنچل انگلی سے انجانے میں ٹوٹ گیا ہے

اور موجوں کی مدرا پی کر ناچ رہے ہوں چٹیل میداں

اب نہ یہاں کوئی بھوکا ہے اب نہ یہاں کوئی پیاسا ہے

میں نے یگوں کے تشنہ لبوں کو میں نے صدیوں کے بھوکوں کو

ناری کے پیالوں میں پلا کر سرخ لبوں سے بھوگ کھلا کر

ان کی گم سم آتماؤں کو ایک نیا نروان دیا ہے

بھوک تو ہے انسان کی فطرت اسکا انھیں عرفاں دیا ہے

کیا ہے زندگی کیا ہے تپ جپ اور کسے کہتے ہیں مکتی

میں نے جنم کے بھٹکے ہوؤں کو جیون پتھ کا گیان دیا ہے

اور ساحر کے جال کو میں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے"

لیکن کام دیو کے جادو پر خوب ہنسا فرزانہ ساحر

جیسے اُسکے پنج رسوں کے تیر نہیں، ہیں گھاس کے تنکے

کام کو ساحر گلے لگا کر لہجۂ پر اسرار میں بولا

"تو بھی میرے پیکر کا اک اُمرانگ ہے اے دیوانے!

خالق کا پر بھاؤ نہیں ہے سر سے پا تک خود خالق ہے

دھرم کا فرض بنیادی ہے نر ناری پر تیری پوجا

بھول گیا مستی میں پگلے، جگ کی پہلی بھور کا منظر
تیرا خمیر تو میرے خمیر کے ساتھ ہی صبحِ ازل میں گُندھا تھا
یاد نہیں ممنوعہ شجر سے تو نے امرِت پھل توڑا تھا
اُٹھ دنیا کے سارے پیاسے اوک لگائے کھڑے ہوئے ہیں
اپنے تیروں کے پیالوں سے انکو پلا دے پریم کی مدرا
تو ساقی ہے تو خالق ہے تو رازق ہے تو سب کچھ ہے
یہ سنتے ہی دیوداسیاں مندر کے کونوں سے پھوٹیں
نرت کی تال پہ اک ساحر کیا سارا عالم ناچ رہا تھا
کام دیو بھی وجد کناں تھا تیر و کماں بھی ناچ رہے تھے
ایک طرف یہ جشن کا عالم، اور اِس جشن کے شورِ صدا پر
مظلوموں کے خوں کے سمندر مندر مندر ناچ رہے تھے
پوٹ تضادوں کی یہ ماضی اور میں عاشق اس ماضی کا
کیوں عاشق ہوں کیوں دیوانہ؟
جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں
کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

میری زخمی دھرتی ہی نے آخر اک اعجاز دکھایا
خون اور ہڈیوں کی کیچڑ سے کئی کنول روتے ہوئے پھوٹے
پھوٹ کے اتنے ابھرے اتنے اُبھرے نیل گگن سے جا ٹکرائے

انکی مہک نے بحر و بر کو اک نئی خوشبو سے مہکایا

انکے پھولوں نے دنیا کو عطر و نکہت سے نہلایا

انکے تبسم نے زخموں پر چھڑک دیا امرت کا مرہم

انکی خوشبو نے مقتل میں بہا دیئے گنگا کے دھارے

انکے تعطر نے مرجھائے پھولوں کو اک تازگی بخشی

انکے تاثر نے مشہد کو ایک نیا فردوس بنایا

راج محل سے جھونپڑیوں تک انکی خوشبو نغمہ کناں تھی

جتنے ڈھیر تھے گندہ دلی کے انکی خوشبو کے نغموں سے

بن گئے لالہ و گل کے چشمے مہک اٹھا سنسار کا تَن مَن

ہر سو جوہی، موتیا، بیلا، چمپا اور کمد مسکائے

اور خونِ ناحق کے سمندر انکے عکسِ پاکیزہ سے

بنے نئی تقدیس کی گنگا ہو گئے نورِ رواں کی جمنا

اور ارضی کنولوں کی مہک نے اپنا پیام گگن پر بھیجا

ہنس کے گگن سے ستارے اترے ایک نرالا نغمہ لے کر

''انساں ہی اپنا خالق ہے انساں ہی اپنا رکھوالا

دھرم ہے کانٹوں سے بھی محبت دھرم ہے قاتل کی بھی سیوا''

نیک و بد کا مجموعہ تھا ماضی کیا تھا

ہر شے جو بھی مٹ جاتی ہے

اس سے محبت ہو جاتی ہے

اس سے عقیدت ہو جاتی ہے

اس سے جنوں بھی ہو جاتا ہے

نغمہ کناں یہ سندر چڑیاں فطرت کے یہ اُڑتے نغمے

برگ گل سے بھی اُجمل ہیں، جنکے نازک نازک شہپر

موروں کے رقاص بجائے جنگل کے ہر گھر میں ناچے

ہرنوٹے خوشیوں سے چھلانگیں بھرنے لگے اب آنگن آنگن

کوئی اپنی مُرلی لے کر گھر کے جھروکے میں آ بیٹھی

ساز اٹھا کر اپنا پپیہے بن گئے کوئل کے سازندے

ان کنولوں کی خوشبو پھیلی، اتنی پھیلی اتنی پھیلی

نکہت اُبلی جنگل جنگل چھلک اٹھے نیلم سے سمندر

دبی ہوئی سُمدھا کے تنکے برگد اور پیپل کہلائے

صدیوں کے پس ماندہ مسافر انکی چھاؤں میں آ کر ٹھیرے

ہری گھاس جو پاگل پن میں جھونک دی جاتی تھی شعلوں میں

اسکے جلے ہوئے تنکوں نے ایک مہکتی خنکی پائی

ایک نئی روئیدگی پائی ایک نئی پائندگی پائی

اور ہر شعلے کو پہنایا نرمل جل کا آبی بانا

ان کنولوں کی خنک مہک نے آتشیں ساحر کے حلقوں کو

اپنے جھونکوں کے پرتو سے ٹکڑے ٹکڑے کر ہی ڈالا

ان ٹکڑوں کی ارتھی پر اب نعش ساحر پڑی ہوئی تھی

اور خود اسکے سحر کے شعلے اسکی ارتھی پھونک رہے تھے

جتنے ساتھی جادوگر تھے وہ بھی جل کر خاک ہوئے تھے

آخر موجِ ہوا نے انکے بد بو اور سیہ "پھولوں" کو!

بحرِ فنا کی آخری تہہ میں ڈبو دیا پاتال کی تہہ تک

اب کانٹوں میں اور پھولوں میں نام کو بھی مت بھید نہیں تھا

صرف صبا تھی صرف مہک تھی صرف کرن تھی صرف سویرا

گھور اندھیرے کے سینے کو توڑ دیا تھا ضربِ سحر نے

نور ہی نور تھی ساری دھرتی رات کو بھی دن سا رہتا تھا

میرے تن کا چوتھا ٹکڑا اب کچھ آزاد ہوا تھا

اسکے دل کے ٹکڑوں کا خون اب بہنے سے رُک سا گیا تھا

جتنے پہاڑ تھے اب میداں تھے جتنے میداں تھے سب گلشن

گو ان کنولوں کے مکھڑوں کو بادِ صرصر نے مرجھایا

پھر بھی صدیوں صدیوں انکی خوشبو نے جگ کو مہکایا

اس دھرتی پر کنول کھلے ہیں کِھل کِھل کر پھر مرجھائے ہیں

سینکڑوں یاں تارے چمکے ہیں اور چمک کر ڈوب گئے ہیں

دھرا کی دوسری اور چمکنے نئے اندھیروں کو چمکانے

ساحر پورے جوش و غضب میں ایک انوکھے روپ میں اٹھا

انگ انگ سے اس نے اپنے وحشی شعلوں کی لپٹوں سے

صدیوں کے آثارِ خرد پر اپنی نئی کمندیں پھینکیں

کنول کنول کو جال میں پھانسا اور سمندر پار بھگایا
قرنوں کی پائندہ خوشبو اس نے مسل ڈالی حکمت سے
سندر جھیلوں کے سینوں کو پاٹ دیا اُسنے کشتیوں سے
چلنے لگے پھر آگ کے جھکڑ بہنے لگے پھر خون کے دریا
کنول کنول کے مندر اس نے مٹی کے ٹیلوں سے ڈھانپے!
جیسے یہاں نکہت تھی نہ شبنم جیسے کنول تھے اور نہ جھیلیں
پھر وہی قاتل پھر وہی مقتل پھر وہی مردے پھر وہی مرگھٹ
پھر وہی رقص جورِ مسلسل پھر وہی جشنِ فغاں و نالہ
پھر وہی حلقۂ دامِ تو ہم پھر وہی دامِ طوق وسلاسل
پھر مری دنیا گردش کھا کر صدیوں پیچھے لوٹ گئی تھی
پھر وہی پیالے چھلک رہے تھے پھر وہی خنجر چمک رہے تھے
جیسے کچھ صدیوں کیلئے یہ کسی نگر کو نکل گئے تھے!؟
اٹھی گرد وغبار وخوں کی چار طرف سے کالی آندھی
اس آندھی کی کوکھ سے ٹپکے تیر وکماں، خنجر، تلواریں
گھوڑوں کی ٹاپوں کے گولے، اَن سمجھی برقی للکاریں
وحشی آنکھیں قاتل چہرے، ننگی وحشت آگ کے دریا
دیکھا تو ہر سو سے لٹیرے میرے گھر پر ٹوٹ پڑے ہیں
شاخ شاخ تلوار کے سایے، پھول پھول دہکے انگارے
اور میرے گھر کا چپہ چپہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے

کوچہ کوچہ اک مقتل ہے گلی گلی میں اک پھانسی گھر

اور مری دھرتی کی چھاتی سے خوں کے سمندر ابل رہے ہیں

اس طوفانِ خاک وخوں میں میرے تن کا چوتھا ٹکڑا

خون میں لت پت، زخم سراپا پردے کی اک اوٹ پڑا ہے

کوئی نہ سنگی، کوئی نہ ساتھی، کوئی نہ شکتی، کوئی نہ مکتی

اس طوفاں میں بھی بس اسکی ساتھی اک گندی جھاڑو ہے

گویا یہ تلوار ہے اُسکی، گویا یہ خنجر ہے اُسکا!؟

وقت سے بھی دیکھا نہ گیا اور گرادیا منظر پر پردا!

اور اپنے گھوڑے پر چڑھ کر گذر گیا جیسے کوئی جھونکا

جا کے ماضی کے مرگھٹ میں لیٹ گیا جیسے کوئی مُردا

نئے افق سے تازہ سورج میری دھرتی پر پھر چمکا!

اور ہستی کے منچ پہ آ کر اپنی کرنوں کے ہاتھوں سے

اُسنے ناٹک کے چہرے سے آخری پردے کو بھی اٹھایا

دیکھتے کیا ہیں گلیوں گلیوں، لاکھ نئے بازار کھلے پن

جیون گویا اک منڈی ہے، ہستی گویا اک میلا ہے

اِس منڈی میں راجہ، رانی، دیوتا، ساحر سب بکتے ہیں

آٹا دالیں بیچنے والا، ساری جنسوں کا مالک ہے

مالک کیا ہے خود راجہ ہے راجہ کیا ہے اَن داتا ہے

خود رستہ ہے خود رہبر ہے خود دریا ہے خود دنیا ہے

اور ظالم نے سارے مٹکے بھر ڈالے ہیں سیم وزر سے
سنگِ موسیٰ کے آنگن میں لاکھوں کوہِ نور جڑے ہیں
راج محل سے جھونپڑوں تک کی اور ساحر کے مندر تک کی
رفتہ رفتہ اس ظالم نے لوٹ لی ہے ہر گھر کی شوبھا
اپنے جال میں شام وسحر کو اُس نے ایسے جکڑ لیا ہے
وہ چاہے تو سورج نکلے، وہ چاہے تو سورج ڈوبے
چاروں اور خموشی طاری ہر سو اک تاریکی حاوی
گھور اندھیرے کی نگری میں صرف اسی کا دیا جلتا ہے
اور دیئے کی جوت کے نیچے رینگ رہا ہے اک سایہ سا
کون ہے یہ؟ کیا کوئی قاتل؟ یا کوئی ڈاکو؟ یا کوئی اجگر!؟
جوت نے جب دامن پھیلایا تو میری آنکھوں نے دیکھا
ساحر اک میلا سا کمنڈل لے کر اسکے در پہ کھڑا ہے
پیلی آنکھیں خاک آلودہ عرق عرق اور کمر خمیدہ!
جیسے کسی بدروح کا پرتو جیسے کسی عفریت کا سایا
اور پردے کی آڑ سے ہٹ کر میرے تن کا چوتھا ٹکڑا
اپنے لختِ جگر کو لے کر قربانی دینے کو کھڑا ہے
دھرم کی جے!، یہ جشنِ ذبیحہ صدیوں صدیوں ہوتا رہا ہے
میرے بھگوانوں کے لبوں کو خونِ گرم خنک کرتا ہے!؟
میری دھرتی کا سینہ ہے سرخ میرے پیاروں کے لہو سے

گونج رہی ہیں موجِ ہوا میں ابتک مظلوموں کی آہیں

خونِ گرم پیا ہے اتنا میرے خداؤں کے قدموں نے

جس پائے سنگیں کو نچوڑوں خون کی نہر رواں ہو جائے

اور لہو کا قطرہ قطرہ مظلوموں کی زباں ہو جائے

وقت نے گو ساحر کا جادو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے

پھر بھی میرے چاروں طرف ساحر کا تصور رینگ رہا ہے

جیسے کوئی ناگ پھنیرا زخمی ہو کر وِش برسائے

آج بھی لاکھوں وہم کے بندے جال میں اسکے پھنسے ہوئے ہیں

آج بھی سب یوں کانپ رہے ہیں جیسے صدیوں کے مجرم ہوں

اور مقتل میں حکم ہوا نکو لے کے چلیں وہ صلیب خود اپنی

اور میرے تن کا چوتھا ٹکڑا آج بھی ظلموں کا ہے نشانہ

طوق و سلاسل پگھل گئے ہیں لیکن وہ آزاد نہیں ہے

آج بھی بھوک اسکو ڈستی ہے آج بھی پیاس اسکو کھاتی ہے

نگر نگر فٹ پاتھ کے پتھر آج بھی اسکے رنگ محل ہیں

کیا کوئی ان بھوکے پیاسوں کا اس جنگل میں راہ نما ہے؟

کیا کوئی دیوتا ہے دھرتی پر کیا کوئی انسانوں کا خدا ہے؟

آج بھی اسکے دل کے ٹکڑے آج بھی اسکے دکھ کے سہارے

آج بھی اسکے گلاب اور دیپک آج بھی اسکے گھر کے ستارے

ذبح کئے جاتے ہیں اکثر دیوی کے سنگین چرنوں پر

پھونک دیئے جاتے ہیں زندہ جیسے کوئی گھاس کا پولا
جیسے ہری کلیوں کی ٹہنی ڈال دے جلتی آگ میں کوئی
جیسے گلاب کی شاخ کو کوئی اڑتے ہوئے شعلوں میں جھونکے!

آج بھی ماضی کا سایہ ہے آج بھی راج ہے تاریکی کا

ایک سمندر ایک اندھیرا
نقشِ عدم، معدوم سراپا
اور میں دوانہ اِس ماضی کا

جانے میں ماضی سے محبت کیوں کرتا ہوں؟
کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

(تبدیلی بحر کے ساتھ)

ہر لمحہ کی تقدیر میں ہے اک آن میں ماضی ہو جانا
ذخّارِ ابد میں گھل جانا جبّارِ عدم میں کھو جانا
جانے لمحوں کے غبارِ پا سے جو لمحہ بھی ابھرتا ہے
شعلہ فشاں ہے قاتل خود ہے خاک وخوں میں لتھڑا ہوا ہے
ہر نیکی اک رقصِ شرر ہے، اور ابدی اڑتی چنگاری
روشنی اک برقِ مستعجل اور اندھیرا کیف قائم
علم و وجداں حالِ گذراں فطرتِ انساں ثابت و دائم

اور ماضی صحرائے لق و دق اور ماضی بحر بے پایاں

بیتے ہوئے لمحوں کو پکڑنا لفظوں سے آسان نہیں ہے

یہ ہے وہ منزل جس منزل پر قلم کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں

کیا ہو بیاں افسانۂ ماضی خوں میں ڈوبا ہوا گر تا ہے

دار و رسن کی ایک کہانی طوق و سلاسل کا ایک قصہ ہے

میں اس قصے پر مرتا ہوں!؟

میں بھی کوئی کیا قاتل ہوں؟

میں بھی کوئی آتش زن ہوں؟

یا میں کوئی دیوانہ ہوں؟

جانے میں کیا ہوں

جانے کیوں ماضی سے محبت کرتا ہوں؟

کیوں ماضی پر مرتا ہوں؟

تھی شب ہی نہیں خوں کا دریا ہے صبح بھی خوں کی جوئے رواں

اس جوئے رواں کے ساحل پر اک شہر بسا ہے کھنڈروں کا

اور انکے بام و در پر بھی ہے گرم لہو سے نقاشی

آزادؔ کے خوں سے نقاشی، اشفاقؔ کے خوں سے صناعی

سکھ دیوؔ کے خوں سے گل پوشی اور دتؔ کے لہو سے زرکاری

اودھم کے لہو سے گلکاری اور خونِ بھگت سے گلکاری [1]

بھولے گی نہیں انسانیت اس لمحہ محشر زا کو بھی

جب ناگاساکی ہیروشما پر زہر کا پیالہ اُلٹا تھا

افلاک سے دوزخ برسا تھا، دھرتی پہ جہنم گرجا تھا

بے پایاں رودِ آتش کا اک خونیں بھونچال آیا تھا

تھی موت ہر اک سو بکھری ہوئی اور زیست فقط سایہ سایا

اور آج بھی گوشے گوشے میں دیرینہ قاتل خنداں ہیں

محبوبہ دوشیں کے عاشق چپے چپے پہ خراماں ہیں

گاندھی کے خونِ گرم سے ہے اک جشن چراغاں محفل میں

لوتھر کے لہو کا ہر قطرہ ہے شعلہ بداماں محفل میں

ویتنامی جیالوں کے خوں سے گلکاری سی گلکاری ہے

کمبوڈی جوانوں کے خوں سے نقاشی سی نقاشی ہے

مٹی ہے بیر بہوٹی سی سبزے پہ شفق سی خنداں ہے

مقتول زمین کی چھاتی پر جو شے ہے لہو میں غلطاں ہے

وحشت نے سجائے ہیں کیا کیا آئینہ خانے رنگ محل

اور ان میں جلائی جاتی ہے ننھے منوں کی شمعِ بدن

---

[1] مقالہ از مولانا خورشید احمد فارق پروفیسر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، ''دورِ علوی میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت''، صفحہ نمبر ۲۲

بخشے ہیں امن پرستوں نے اگنی کو کیا نادر تحفے

سرشار جوانوں کے چہرے دوشیزہ عروسوں کے مکھڑے

کاجل بھری آنکھوں کی شمعیں مستی سے بھرے نینوں کے دیئے

خوشبو میں بسے کنگن کی کھنک مہندی سے رچے ہاتھوں کی پھبن

اَن چھوئی جوانی سے لپٹی چرنوں پڑتی پائل کی صدا

ہوتا ہے عروسی جسموں سے یاں جشن چراغاں بادِ صبا

اگنی کی قاہر لپٹوں سے چاندی کا پگھلنا بھی دیکھو

دہکے دہکے انگاروں سے سونے کا پگھلنا بھی دیکھو

یہ پہونچیاں تھیں یہ چوڑیاں تھیں اور یہ تھے سونے کے کنگن

اب کاکل کے ہاتھوں میں نہیں چوروں کی جیب میں جائینگے

گھر گھر میں جمیگی بزم طرب اور جام اڑائے جائینگے

ریشم کی اوڑھنی بھی دیکھو شعلوں کے دہکتے جسموں پر

یہ پڑنے والی تھی اکدن کاکل کے شب گوں شانوں پر

جس دیش میں مرد و عورت کا صرف ایک ہی رشتہ تھا لوگو!

اس دیش میں اب ہر عورت جذباتِ ہوس کا کھاجا ہے

حیراں ہوں ساکت ہے دھرتی کیوں دھرتی الٹ نہیں جاتی

کیوں فلک ہے قائم اپنی جگہ کیوں سورج بے بس و بے حس ہے

کیوں تارے ٹوٹ نہیں پڑتے، بھونچال ہے محوِ خواب کہاں

اللہ، پیمبر، اور ملک، سب گہری نیند میں ہیں غلطاں

اربابِ فلک کا کیا کہنا، سب میرے پڑوسی سوتے ہیں!؟
ماتم کرواے دنیاوالو! ہمسایے کا رشتہ خاک ہوا

اب حال پہ ماضی چھایا ہے
ماضی سے بچ کے کہاں جاؤں
ماضی اوّل، ماضی آخر

(پھر قدرے بحر بدل کر)

کیڑے کھائے ہوئے پرزوں کے مٹے مٹے سے نقش پکارے
اسکا ورثہ پاک کنول تھے، مسکانیں تھیں مشفق سینے
ہم آغوش، ہم آہنگی، ہم سفری بے پایاں جذبے
لاکھ امنگیں برابری کی عدل ووفا کی، پریم دیا کی
انسانوں کا ذکر نہیں ہے حیوانوں پر جان فدا تھی
خاک شدہ اوراق کی تہہ میں، کرم زدہ الفاظ کے سایو!
دم بھر کو زندہ ہو جاؤ پل بھر کو آنکھیں تو کھولو!
میرے جہل کی پیاس بجھاؤ میری خرد کی بھوک مٹاؤ
حق کیا تھا یہ کچھ تو بتاؤ حق کیا ہے کچھ تو سمجھاؤ؟
دھرتی کی پوشیدہ امانت میرے پرکھوں کے اے ڈھانچو!
گو تمہیں قرنوں کے جادو نے سنگ میں ڈھال دیا ہے لیکن

پھر بھی مٹی کے باس ہو مٹی تکیہ مٹی بستر!

مٹی ماتا مٹی داتا مٹی اوّل، مٹی آخر

اب وہی مٹی، جس مٹی نے تمھیں گلوں سینے سے لگایا

صدیوں سے جو بنی رہی تھی پیار اور ممتا کا گہوارا

جس کی شرن میں تم قرنوں سے مکت رہے ہو دستِ فنا سے

دردِ سزا سے، خوفِ جزا سے، ہستی کے ہر دامِ بلا سے

اب وہی مٹی، ہاں وہی مٹی دھرتی ماں کی مانگ کی لالی

تجدید اسرار بنی ہے نطق و زمان و ذات بنی ہے

شرقِ نورِ صفات بنی ہے مظہرِ رمزِ حیات بنی ہے

آج تو سرِّ حیات بتادو، پردہ روئے حق سے اٹھا دو

چھوڑے ہوئے ورثے کی حقیقت اپنے وارث کو بھی بتا دو

سچ مچ کوئی ورثہ تھا بھی سچ مچ کوئی دولت تھی بھی؟؟

یا یہ سب تھا ایک افسانہ، ایک کہانی، ایک قصیدہ

یا تھی فقط رومان پسندی یا تھی فقط آدرش تراشی

یا تھا فقط تخیل کا جادو یا تھا طلسمِ خوابِ تمنا

یا تھا فقط خوابوں کا سایہ گڑی ہوئی تاریخ کا ملبا

صدیوں کی سوکھی ہوئی آنتیں قرنوں کی کچلی ہوئی لاشیں

رسمِ غلامی قتل کے جذبے اور فقط ذوقِ قزاقی!؟

کہاں ہیں جذبے برابری کے سپنے ارضی رزاقی کے

کہیں ہیں امنِ دہر کے نقشے خلدِ آزادی کے خاکے؟

تو کیا بس یہ جبر مسلسل، تو کیا بس یہ غم کا تسلسل

تو کیا یہ شکست پیہم تو کیا بس یہ فتح مسلسل

تو کیا مسلسل تاریکی ہی تاریکی ہی اجیالا ہے

تو کیا مطلق ناپیدی ہی لے دے کر اپنا ورثہ ہے

یعنی ہر دم بے بس جینا، یعنی ہر دم بے کس مرنا

اور فنائے مطلق کے بے پایاں سمندر میں گھل جانا

زیست نہ جانے کس کے گناہِ شوق کا لوگو خمیازہ ہے

حق ہے اگر تو کیوں نہیں ڈھلتا نئی حقیقت کے سانچے میں

نئی حقیقت کیوں نہیں بھرتی رنگ مرے دھندلے خاکے میں

ستیہ کہاں ہے؟ پریم کہاں ہے؟ عدل کہاں ہے؟ رحم کہاں ہے؟

حسن کہاں ہے عشق کہاں ہے امن کہاں ہے نجات کہاں ہے

عقل کہاں وجدان کہاں ہے حکمت اور عرفان کہاں ہے

علم کہاں ہے گیان کہاں ہے دھرم کہاں ایمان کہاں ہے

عالم عالم ایک اندھیرا، دنیا دنیا ایک سناٹا

انسان اور خدا دونوں ہی اس دنیا میں جانے کہاں ہیں؟

آج بھی میرے جان وتن پر ایک درندہ پاؤں جمائے

میری رگ رگ نوچ رہا ہے میرے لہو کو چوس رہا ہے

اور اسکی خونیں آنکھوں سے پیاس کی جوالا پھوٹ رہی ہے

آہ انسانوں کی قسمت میں پاک کنول نغمے اور شبنم

اور مری تقدیر میں کانٹے، خنجر، نالے، خون کے آنسو

جلتے ہوئے شہروں کا دھواں، آہوں کے دھوئیں میں غلطیدہ

روز کی اک تفریح شی ہے ٹیلی وژن پہ رقص و نغما

نغمۂ و رقص کی موسیقی، پر لاشوں کے انبار کے منظر

جلے ہوئے بچوں کے پیکر پھنکے ہوئے امصار کے منظر

رسیاں وہ ناپختہ پھلوں کی خاکستر تازہ غنچوں کی

اوس بھرے پھولوں کے جنازے ارتھیاں ہری ہری شاخوں کی

دیکھنا اور بے پروا ہو کر خواب راحت میں سو جانا

جیسے انسانوں، شہروں اور بچوں کا یوں کوئلہ ہونا

ظلم قیامت خیز نہیں ہے کوئی عجوبہ بات نہیں ہے!؟

اور گجر دم اُٹھکر تازہ قتلوں کی روداد کو پڑھنا

اور یوں بے حس ہو کر پڑھنا، جیسے ہم میں روح نہیں ہے

جیسے ہم لوہے کے بت ہیں، یا ہم سنگ شدہ ممیاں ہیں

اپنی صدی ماضی کیطرح تاریخ کی سب سے خونیں صدی ہے

وقت کا سب سے قاتل دور ہے لمحہ لمحہ اسکا درندا

نَفَس نفس اسکا ایٹم ہے، اسکا سایہ موت کا سایا

ماضی خوں میں لتھڑا ہوا تھا، حال بھی خوں میں ڈوبا ہوا ہے

حال بھی ماضی، فردا ماضی

ساغر نظامی کی نایاب نظم 'ماضی' - تجزیاتی مطالعہ

جو کچھ ہے فانی ہی فانی

جو کچھ ہے ماضی ہی ماضی

(قدرے تبدیلی بحر کے ساتھ)

ہر لمحہ چھوڑ کے جاتا ہے اک ریگستانِ تشنہ لبی

کل روحِ جبلت پیاسی تھی، اور آج بھی ظالم ہے پیاسی

جو حال ہے خوں میں ڈوبا ہوا، جو فردا ہے خوں کا پیاسا

اے دیوی کچھ تم ہی کہو کیا انت نہیں اس مقتل کا؟؟

....

اے دیوی تم امر کنول کی امر مہک ہو جس سے معطر عالم عالم

ابدنشاں تخلیق کا چشمہ، ممتا اور امید کا سنگم

قافلے پھولوں اور کانٹوں کے لاکھوں یاں سے ہو کر گذرے

قافلے پھولوں اور کانٹوں کے لاکھوں یاں سے گذرتے رہینگے

لاکھوں بہاروں اور خزاں کی خاک میں تم تارا ہی رہو گی

تم ہو پھلوں کی تازہ ٹہنی ہر رُت میں تازا ہی رہو گی

عرفاں ہو گا تیرا اسکو ایک دن ایسا بھی آئیگا

خون میں ڈوبے تیغ و خنجر دھو ڈالینگی دودھ کی دھاریں

تم ہو ازل سے قصر ابد تک خشک نہ ہونے والی گنگا

کبھی تمہاری مواجی کو فنا کا دھارا چھو نہ سکیگا

تم مانجھی ہو ہر نیا کی، ہر طوفاں کا تم ہو کنارا

تم ماتا ہو تم ہی بہن ہو تم بیٹی تم ہی محبوبا

تم ہی پُجاری، تم ہی پجارن، تم ہی مندر تم ہی دیوی

سارے خدا پنہاں ہیں تم میں سارے دیوتا تم سے پیدا

اے میری شجر ممنوعہ! جب تک تو شاداب و جواں ہے

جب تک اپنے نشیلے پھلوں سے تیری شاخیں جھکتی رہینگی

جب تک پھل مسکاتے رہینگے، اپنی سمت بلاتے رہینگے!

جب تک میرے لبوں میں ہے صہبائے فطرت کی طغیانی

جب تک میرے خوں میں ہے اک جذبۂ یزداں کی جولانی

جب تک تم ہو اس دھرتی پر معجزے یاں اگتے ہی رہینگے

نئے ستاروں کی دھرتی پر آدم پھینکے جاتے رہینگے

نئی زمینوں کے کنجوں میں نئے فلک کے ایوانوں میں

نئے شبستاں کھلتے رہینگے، نئی شرابیں ڈھلتی رہینگی

دورِ ساغر چلتا رہیگا چلتا رہیگا چلتا رہیگا

اس ظالم قاتل دنیا میں آس کا تم ہو نہا پرچم

اے دیوی تم اَمر کنول کی اَمر مہک ہو، تم سے معطر عالم عالم

●●●●

کتابیات

۱۔ ساغر نظامی کے مرتب کردہ حالات

۲۔ ساغر نظامی فن و شخصیت۔ — ضامن علی خان

۳۔ تاریخ جھجر — مؤلف غلام نبی

۴۔ تذکرہ بہارستان

۵۔ ہم عصر شعراء کے خطوط — مرتب ضیاء الاسلام

۶۔ ہندوستانی تحریک اروا اس کی تاریخ — ڈاکٹر تاراچند

۷۔ بادۂ مشرق — ساغر نظامی

۸۔ داستانِ چند — راز چاندپوری

۹۔ خمخانۂ جاوید — لالہ سری رام

۱۰۔ شکنتلا — ساغر نظامی

رسائل

۱۔ ماہنامہ آجکل دہلی دسمبر 1984

۲۔ بیسویں صدی اپریل 1984

۳۔ ہفت روزہ مگدھ پنچ 16 دسمبر 1984

۴۔ ہفت روزہ نئی دنیا، ۲۰/تا ۲۶/مارچ 1984

۵۔ روزنامہ الجمعیۃ ۲۹/فروری 1984

Saghar Nizami Ki Nayab Nazm

Maazi

(Tajziyati Mutala)

Dr. Farooq Bakhshi

نام: ڈاکٹر فاروق بخشی

تعلیم: ایم اے پی ایچ ڈی

ملازمت: صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج

کوٹہ یونیورسٹی، کوٹہ (راجستھان)

دیگر تصانیف:

۱۔ پلکوں کے سائے (شعری مجموعہ۔ ہندی)

۲۔ اداس لمحوں کے موسم (شعری مجموعہ اردو)

۳۔ وہ چاند چہرہ سی ایک لڑکی (شعری مجموعہ۔ ہندی)

۴۔ مفاہیم (تنقیدی مضامین)

۵۔ ساغر نظامی کی نایاب نظم۔ ماضی۔ ایک تجزیہ

۶۔ اردو ادب میں طنز و مزاح (زیر طبع)

۷۔ راجستھان میں جدید اردو غزل (زیر طبع)

۸۔ اردو ادب آزادی کے بعد (زیر طبع)